انگریزی شاعری کی ایک جھلک

چاسر سے ایلیٹ تک

سیّد شاکر علی جعفری

ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

نیو وے پبلشرز کراچی

انگریزی شاعری کی ایک جھلک

چاسر سے ایلیٹ تک

جس میں

سات صدیوں پر محیط انگریزی شاعری کا سرسری جائزہ بمعہ پچاس سے
زائد انگریزی شعراء کے مختصر حالات اور نمونہ کلام کے طور پر اِن کی بعض شاہکار
نظموں کے منظوم تراجم پیش کئے گئے ہیں

مُصنّف

سیّد شاکر علی جعفری

ایم۔ اے؛ بی۔ ٹی (علیگ)

نیو وے پبلشرز کراچی

طبع اوّل ———— جنوری ۱۹۹۴ء

تعداد ———— ایک ہزار

طباعت ———— جدید پرنٹرز کراچی

ناشر ———— نیو وے پبلشر

A-17/I ، ڈرگ کالونی کراچی

قیمت ———— ۱۲۰/ روپے

ملنے کا پتہ

نیو وے پبلشرز

A-17/I ، ڈرگ کالونی، کراچی۔ فون:۔—— 4570961

انگریزی شاعری کی ایک جھلک

بصد عقیدت و احترام

اپنی مادرِ تعلیم

علی گڑھ مُسلم یُونیورسٹی کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوان		صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ (پروفیسر سحر انصاری)		۱۳
۲	دیباچہ		۱۹
۳	چاسر (اسکوائر)	Chaucer (The Squire)	۲۹
۴	واٹ	Wyatt (Sonnet)	۳۳
۵	اسپنسر	Spenser	۳۵
	(اے خوش شاروز!)	(Prothalamion)	۳۷
۶	مارلو		۳۹
	(ہم تم)	Marlowe (Pastoral Song)	۴۰
۷	شیکسپیئر	Shakespeare	۴۲
	(i) وقت	(Two Sonnets)	۴۴
	(ii) ماورائے وقت		۴۵
۸	سترھویں صدی کے برطانوی شعرا		۴۶
۹	ڈن		۴۷
	(i) موت	Donne (i) Sonnet	۴۹
	(ii) فراق وصال	(ii) Presence in Absence	۵۰
۱۰	بین جونسن	Ben Jonson	۵۱
	(چاند دیوی)	(Hymn to Diana)	۵۳

۵۴	Milton	ملٹن	۱۱
۵۷	(i) On His Blindness	(i) اپنے نابینا ہونے پر	
۵۸	(ii) L Allegro	(ii) خوش دلی	
۶۰	Shirley	شرلے	۱۲
۶۲	(Death the Leveller)	(قدریں)	
۶۲	Lovelace	لولیس	۱۳
۶۳	(To Althea from Prison)	(زنداں سے اپنی محبوبہ کے نام)	
۶۵	Marvell	مارویل	۱۴
۶۶	(A Garden)	(ایک باغ)	
۶۸	Cowley	کاولے	۱۷
۶۹	(A Supplication)	(ساز سخن)	
۷۱	Vaughan	واگھان	۱۸
۷۳	(The Retreat)	(واپسی)	
۷۶	Dryden	ڈرائیڈن	۱۹
۷۸	(Song on St. Cecilia's Day)	(ساز مقدس	
۸۱		اٹھارویں صدی کے شعرا	۲۰
۸۲	Pope	پوپ	۲۱
۸۳	(i) Slitude	(i) سکون قلب	
۸۵	(ii) from Essay on Criticism.	(ii) کم علمی	
۸۷	(iii) from Essay on Man	(iii) مطالعہ انسان	
۸۹	Swift	سوئفٹ	۲۲
۹۱	(On the Death of Dr. Swift)	(اپنا مرثیہ	

۹۴	Gray	گرے	۲۳
۹۶	(Hymn to Adversity)	(گردش دوراں)	
۹۹	Dr. Johnson	ڈاکٹر جانسن	۲۴
۱۰۱	(Scholar's Life)	(دانشور)	
۱۰۴	Goldsmith	گولڈ اسمتھ	۲۵
۱۰۶	(from Deserted Village)	(اجڑا ہوا گاؤں)	
۱۰۹	Cowper	کوپر	۲۶
۱۱۱	(Solitude of Selkirk)	(تنہائی)	
۱۱۴	Burns	برنس	۲۷
۱۱۵	(A. Farewell)	(رخصت اے دوست!)	
۱۱۷	Blake	بلیک	۲۸
۱۱۹	(To Muses)	(حسینان معانی)	
۱۲۱		انیسویں صدی کے شعرا	۲۹
۱۲۲	Southey	سدے	۳۰
۱۲۳	(Scholar)	(اپنی لائبریری میں)	
۱۲۵	Wordsworth	ورڈزورتھ	۳۱
۱۲۷	(i) Daffodils	(i) پھول ہی پھول	
۱۲۹	(ii) Cuckoo	(ii) کوئل	
۱۳۲	(iii) Rainbow	(iii) قوس قزح	
۱۳۳	Coleridge	کولرج	۳۲
۱۳۴	(Kubla Khan)	(کبلاخان)	
۱۳۸	Scott	اسکاٹ	۳۳
۱۴۰	(Patriotism)	(حب الوطنی)	

۳۴	بائرن	Byron	۱۴۱
	(ایک گمگشتہ سے)	(i) When We Two Parted	۱۴۴
	(ii) کامرانی	(ii) All About Love	۱۴۶
۳۵	شیلے	Shelley	۱۴۸
	(i) پپیہا	(i) To a Skylark	۱۵۱
	(ii) نوحہ غم	(ii) Threnos	۱۵۵
۳۶	کیٹس	Keats	۱۵۶
	(ایک خاک دان یونانی پر)	(Ode on a Grecian Urn	۱۵۹
۳۷	ٹینی سن	Tennyson	۱۶۲
	(i) آعندلیپ باغ میں)	(i) Come into the Garden	۱۶۴
	(ii) حوالے ناخدا کے ناؤ	(ii) Crossing the Bar	۱۶۸
۳۸	براوننگ	Browning	۱۷۰
	(i) ڈراور موت کا؟	(i) Prospice	۱۷۲
	(ii) خیروعافیت	(ii) All is Well	۱۷۴
۳۹	آرنلڈ	Arnold	۱۷۵
	(ساحل ڈوور)	(Dover Beach)	۱۷۷
۴۰	پیٹ مور	Patmore	۱۸۱
	(کھلونے)	(Toys)	۱۸۲
۴۱	دانتے روزیٹی	Dante Rossetti	۱۸۵
	(اے جان جاں!)	(Lovesight)	۱۸۹

۴۲	سوئن برن	Swinburne		۱۹۰
	(آمد بہار)	(Hounds of Spring)		۱۹۳
۴۳	چند برطانوی شاعرات			۱۹۶
۴۴	ایملی برانٹے	Emily Bronte		۱۹۷
	(نہیں بزدل بخدا)	(No Coward Soul)		۱۹۹
۴۵	کرسٹنا روزیٹی	Christina Rossetti		۲۰۱
	(میری برات)	(A Birthday)		۲۰۳
۴۶	امریکی شاعری کا پس منظر			۲۰۵
۴۷	ایمرسن	Emerson		۲۰۷
	(زمین)	(The Earth)		۲۰۸
۴۸	لانگ فیلو	Longfellow		۲۱۰
	(i) عظمت کے مینار	(i) Psalm of Life		۲۱۲
	(ii) گاؤں کا لوہار	(ii) Village Blacksmith		۲۱۴
۴۹	پو	Poe		۲۱۷
	(ہیلن)	(To Helen)		۲۱۸
۵۰	وھٹ مین	Whitman		۲۲۱
	(سونے کی پھلجھڑیاں)	(Sparkles from Wheel)		۲۲۲
۵۱	بیسویں صدی کی انگریزی شاعری			۲۲۴
۵۲	ہارڈی	Hardy		۲۲۶
	(گولی)	(The Man He Killed)		۲۲۸
۵۳	برجز	Bridges		۲۳۰
	(بلبلیں)	(Nightingales)		۲۳۱

۵۴	کپلنگ	Kipling	۲۳۲
	(چھ طاعت گزار)	(Six Servicemen)	۲۳۴
۵۵	بروک	Brooke	۲۳۵
	(بادل)	(Clouds)	۲۳۶
۵۶	میکفی	Macfie	۲۳۷
	(آمنا سامنا)	(Face to Face)	۲۳۹
۵۷	ایٹس	Yeats	۲۴۲
	(تبسم سوگوار)	(The Rose of the World)	۲۴۳
۵۸	میسفیلڈ	Masefield	۲۴۴
	(سمندر کا عشق)	(Sea Fever)	۲۴۶
۵۹	خلیل جبران	Khalil Gibran	۲۴۷
	(رحم اس قوم پر)	(Pity the Nation)	۲۴۹
۶۰	فراسٹ	Frost	۲۵۲
	(جاتے جاتے)	(Away)	۲۵۴
۶۱	ایلیٹ	Eliot	۲۵۶
	(i) چار عناصر	Two Extracts from	۲۵۸
	(ii) خزاں کی بہار	Little Gidding	۲۶۰

پیش لفظ

پروفیسر سحر انصاری
شعبہ اُردو جامعہ کراچی

ترجمہ ایک بہت مشکل فن ہے۔ نثرپاروں اور غیر تخلیقی تحریروں کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں اس وقت ممکن ہوجاتا ہے جب ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں سے واقفیت ہو اور ترجمے کی مشق بھی ہو۔ لیکن تخلیقی تحریروں خاص کر شاعری کا ترجمہ تو بلاشبہ بہت ہی دشوار ہے۔ ترجمے کے بارے میں ایک فقرہ بہت مشہور ہے کہ ترجمہ اس محبوبہ کے مانند ہے جو اگر "حسین ہے تو باوفا نہیں اور باوفا ہے تو حسین نہیں"

شاعری کے ترجمے کی بابت اس قسم کے رویوں کے باوجود اگر کوئی صاحب ہمت اور اہل ذوق اس طرف توجہ دے تو اس کے جذبے اور فن کی داد ضرور ملنی چاہئے۔ سید شاکر علی جعفری صاحب کو تخلیقی ادب خصوصاً شاعری کے مطالعے اور ترجمے سے گہرا شغف ہے۔ ان کے اندر ایک نہایت مہذب، پاکیزہ اور مخلص انسان چھپا ہوا ہے۔ جس کا اظہار ان کے عام برتاؤ میں بھی ہوتا ہے اور ان کی ادبی تحریروں میں بھی۔ مجھے خاصی مدت سے جعفری صاحب کی

تحریریں پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ اور ان کی یہ صفت ادبی حلقوں کے لئے اجنبی نہیں کہ وہ اردو شاعری کے بہترین نمونوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی زبان کے معروف شعراء کے منظوم تراجم اردو زبان میں کئے ہیں۔ یہ سارا کام اس "مقدس دیوانگی" کے بغیر نہیں ہو سکتا جو بحمد للہ سید شاکر علی جعفری صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

جعفری صاحب نے انگریزی کے کلاسیکی شعراء سے لے کر بیسویں صدی کے اہم شعراء کے منتخب کلام کا ترجمہ چند سال قبل "جام بجام" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں جعفری صاحب نے مشرقی زاویہ نگاہ سے مغربی شاعری کا ایک جائزہ بھی پیش کیا تھا اور ہر شاعر کا جامع تعارف بھی اس میں تحریر کیا تھا۔

سات صدیوں پر محیط انگریزی شاعری کا یہ منتخب منظوم ترجمہ اب نئے اضافوں کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس میں چاسر سے لے کر رابرٹ فراسٹ اور ٹی ایس ایلیٹ جیسے برگزیدہ شاعروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ خلیل جبران کو ملا کر ان شعراء کی تعداد اکیاون ہے۔ نصف صد سے زائد شعراء کے کلام کا منظوم ترجمہ کر کے شاکر علی جعفری صاحب نے اردو کے دامن کو نئے موتیوں سے مالا مال کیا ہے۔ "کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے"

جعفری صاحب کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور ہے اور وہ ہر دو زبانوں کی لسانی، فنی اور شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں سے خوب واقف ہیں۔ چند مثالوں سے جعفری صاحب کے کمال فن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابراہام کاؤلے کی ایک نظم "ساز سخن" کے یہ ابتدائی مصرعے دیکھئے۔

جاگ اے سازِ سخن! جاگ مرے سازِ سخن
ڈال کر دل کی صداؤں پہ سُروں کے پردے
گیت اس طرح مرے سوز و اثر سے بھر دے
درِ خور بارگہ حسن ہو یہ ہدیہ فن

اب ایک جدید دور کی مثال دیکھئے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی نظم Little Gidding کے ایک حصے کا آزاد ترجمہ "چار عناصر" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی مصرعے یوں ایک شعری آہنگ میں ڈھلے ہیں۔

چار عناصر : ہوا، مٹی، پانی اور آگ
جن سے ترتیب ہے زندگانی کا راگ
فی الحقیقت لطیف استعارے ہیں یہ
چند علامات ہیں، کچھ اشارے ہیں یہ
حسن و پاکیزگی، مہر و صدق و صفا
ہیں رموز ان گنت، بہر ذہن و ذکا
ان رموز و کنایہ کے پیش نظر
دیکھئے چند امثال بود بشر

ترجمے میں ایک نوع کی غنایت، بحر، ہم صوت الفاظ اور اظہار کی جمالیات کے ذریعے پیدا کی گئی ہے جو یقیناً قابل قدر ہے۔
جعفری صاحب کے منظوم تراجم کو جو اردو میں میر انیس جیسے شاعر سے اور انگریزی میں شیکسپیئر، ملٹن اور ایلیٹ جیسے مشکل شعراء سے تعلق رکھتے ہیں اہل نظر کے لئے ایک اور ارمغان بے مثل ہے سید شاکر علی جعفری صاحب کی ان کاوشوں کو ناقدین، مبصرین اور صاحبان ذوق نظر نے ہمیشہ سراہا ہے،

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب بھارت کے ایک قابل ذکر محقق ہیں۔ انہوں نے ایک ہزار سے زائد انگریزی نظموں کے اردو تراجم دس جلدوں میں "ساز مغرب" کے نام سے یکجا کر دیئے ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی اسی موضوع پر ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی مقالے میں سید شاکر علی جعفری صاحب کا بھی تذکرہ کیا ہے اور کراچی میں اپنے قیام کے دوران جعفری صاحب کے تراجم کو بے حد سراہا۔

اب جعفری صاحب کے مجموعی کام پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑا منفرد اور بلند پائیہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ امیر خسرو سے فیض تک پچاس شعراء کا منظوم ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور چاسر سے ایلیٹ تک انگریزی زبان کے پچاس شعراء کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ہر شاعر کی زندگی، انفرادی خصوصیات اور طرز سخن پر اس طرح شذرات لکھے ہیں کہ مجموعی طور پر ان سے خود شاعری کی ایک تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔

شاکر علی جعفری صاحب ۱۹۱۵ء میں اٹاوہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک یعنی تیسری جماعت سے بی۔اے تک علی گڑھ سے اکتساب علم کرتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے ۱۹۴۰ء میں بی۔ٹی اور ۱۹۴۶ء میں انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اور کراچی کے مختلف مدارس میں اپنے تجربوں کی روشنی پھیلاتے رہے۔ ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ایک اسکول قائم کر لیا جو بڑی نیک نامی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ گویا جعفری صاحب بنیادی طور پر ایک معلم اور ماہر تعلیم ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ادب کا بھی ایک عمدہ پس منظر رکھتے ہیں۔ جعفری صاحب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں مین خود بھی شاعری کرتے ہیں ان کی کتابوں کے نام ہیں۔

۱۔ جام بجام (انگریزی شعراء کے اردو منظوم تراجم)

۲۔ Eulogies & Elegies

۳۔ لندن کی سیر (منظوم)

اس کے علاوہ جعفری صاحب عربی کے آٹھ نعتیہ قصائد کا بھی انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ جعفری صاحب ایک باعمل، حساس، درد مند اور پختہ عزم و ارادے کے انسان ہیں انہی خوبیوں کی بدولت انہوں نے اپنی علمی اور عملی زندگی کو ایک مثالی رخ دیا ہے۔ جعفری صاحب ماشاء اللہ آٹھ بیٹیوں کے باپ ہیں۔ اور انہوں نے سب کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ اچھی اور خوشگوار زندگی کی راہوں سے بھی وابستہ کر دیا ہے۔ ان کو خود ساختہ ہستیوں کی ایک قابل قدر مثال کے طور پر پیش کر کے ہمارے معاشرے کے بہت سے مایوس ذہنوں کو حوصلے اور تاریک مکانوں کو روشنی کی راہ دکھائی جاسکتی ہے۔

سید شاکر علی جعفری اپنے ذولسانی منظوم تراجم کی بدولت ادب میں ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے انگریزی اور مشرقی زبانوں کی شاعری کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے عروضی نظام کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی یہ کاوش کم اہم نہیں کہ انہوں نے اصل نظم کے مشابہ انداز یعنی اوریجنل رائم اسکیم (Original Rhyme Scheme) کو اکثر جگہ برقرار رکھتے ہوئے انگریزی کی شاہکار نظموں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ جعفری صاحب کے ترجموں میں شاعری کا موضوع اور تاثر یکجا ہو کر ایک حیرت انگیز مسرت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے ترجموں میں شعری لطافت اور زبان و فن کی رعنائیاں مجسم ہو گئی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ انگریزی شاعری اور اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقے سید شاکر علی جعفری کی اس ادبی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور جہاں جہاں ممکن ہے اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

آخر میں دل پر درد کی ایک فریاد بھی سن لیجئے۔ شاکر جعفری صاحب ساری عمر درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ یہاں اساتذہ کی تنخواہوں اور دیگر مراعات کا تصور کیجئے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک معلم اور مدرس معاشرہ کے دوسرے کم اہم اور غیر تخلیقی افراد کے مقابلے میں کس قدر پریشان اور تنگ دست رہتا ہے، اور اگر معاملہ رٹائرمنٹ تک پہنچ جائے تو رہی سہی "خوش حالی" بھی منھ تکنے لگتی ہے۔ ان حالات میں ایک رٹائرڈ معلم کی حیثیت سے جعفری صاحب نے وہ اہم کام کئے ہیں جو فرد کے نہیں اداروں کے کرنے کے کام ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ساری کتابیں اپنے ذاتی مصارف سے شائع کرتے ہیں۔ اس کا صلہ اس کا انعام کہیں سے نہیں ملتا۔ اس تلخ صورتحال پر تبصرہ بیکار ہے کیونکہ انعام دینے والے اور انعام پانے والے دونوں جانتے ہیں اس کے حصول کا "طریقہ کار" کیا ہوتا ہے۔ شاکر جعفری صاحب اہل علم ہیں، صاحب کمال ہیں، ایک گوشے میں بیٹھے علم و ادب کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت اور ظرف کہاں کہ وہ بیوروکریسی اور لابی جیسے سکہ رائج الوقت سے اپنا رشتہ جوڑیں۔

یہ الفاظ میں نے اس لئے تحریر کئے ہیں کہ شاید کسی اہل دل اور صاحب اختیار کی نظر سے گزریں اور وہ اس سلسلہ میں کوئی معقول اقدام کر سکے فی الحال کم سے کم یہ ہو سکتا ہے کہ غیر ملکی ادب کے تقابلی مطالعے کا نصاب بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ کی سطح تک متعارف کرایا جائے اور شاکر جعفری صاحب کی یہ کتاب داخل نصاب کر دی جائے تاکہ نئی نسل اس سے کماحقہ، مستفیض ہو سکے۔

سحر انصاری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

انگریزی نظموں کے منظوم اردو تراجم کا میرا پہلا مجموعہ "جام بجام" کے نام سے چند سال قبل شائع ہوا تھا جسے علمی و ادبی حلقوں میں اندرون ملک اور بیرون ملک میری توقع سے زیادہ سراہا گیا۔ اخبارات اور رسائل نے اچھے الفاظ میں تبصرے شائع کئے۔ دور و نزدیک سے تعریفی خطوط موصول ہوئے جن میں سب سے اہم حیدر آباد دکن سے ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب (آئی۔اے۔ایس) کے کلمات تحسین تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک ہزار سے زائد انگریزی نظموں کے منظوم اردو تراجم "ساز مغرب" کے نام سے دس ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے ایک کارنامہ انجام دیا اور ان کے گراں قدر مقالہ "انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ" پر جامعہ ملیہ یونیورسٹی دہلی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ ایسے صاحب تحقیق و تنقید کے کلمات تحسین میرے لئے انتہائی فخر کا باعث ہیں جنہوں نے مجھے یہ بھی احساس دلایا کہ جس کام کو میں نے اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد محض دل

بہلانے اور خود کو مصروف رکھنے کے لئے اختیار کیا تھا اہل نظر کے نزدیک اس کی قدر و قیمت ہے۔ "ساز مغرب" کی دس جلدوں کو دیکھ کر مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ انگریزی نظموں کے اکا دکا ترجمے تو بہت سوں نے کئے ہیں مگر کسی نے سلسلہ وار اس کام کو انجام نہیں دیا۔ شاید یہ قرعہ فال میرے نام نکل آئے۔ اس خیال نے مجھے مزید ترجمے کرنے کا حوصلہ دیا جس کے نتیجے میں میرے تراجم کا یہ دوسرا مجموعہ "انگریزی شاعری کی ایک جھلک چاسر سے ایلیٹ تک" ہدیہ ناظرین ہے۔

اس مجموعہ تراجم میں سات صدیوں پر محیط پچاس سے زائد شعراء کو احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر شاعر کی بالعموم ایک ایک اور بعض کی دو دو اور تین تین نظموں کے اکثر تراجم ان ہی کے اسلوب (فارم) میں پیش کئے گئے ہیں۔ ہر صدی کے پس منظر میں اس دور کی شاعری کا نہایت مختصر جائزہ اور اس عہد کے نمائندہ شعرا کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ یہ مواد زیادہ تر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا' انسائیکلوپیڈیا چیمبرس' اور "اے کریٹیکل ہسٹری آف انگلش پوئٹری مصنفہ گریئرسن اینڈ اسمتھ" سے لیا گیا ہے۔ اس حاشیہ آرائی کا مقصد عام قاری کو انگریزی شعر و ادب سے قریب تر لانا ہے۔ حسن اتفاق کہ ایسا کرنے سے انگریزی شاعری کی بے حد مختصر تاریخ از خود مرتب ہوگئی اس کو "تاریخ" کہنا تاریخ کی توہین ہے۔ "انگریزی شاعری کی ایک جھلک" البتہ کہا جاسکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی زبان کے ادبی شہ پارے کو خواہ نثر ہو یا نظم' جوں کا توں ترجمہ کرنا قطعی ناممکن ہے' کجا شعر کا ترجمہ شعر میں۔ غالب نے کہا تھا کہ ؎

طرز بیدل میں ریختہ کہنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

غور فرمایئے کہ غالب جیسا شاعر فقط ایک ہندی نژاد فارسی شاعر کا ترجمہ نہیں صرف اس کی طرز میں اردو میں شعر کہنے کو قیامت ٹھہراتا ہے تو پھر درجنوں مغرب نژاد شعراء کو ان کی طرز میں اردو میں پیش کرنے میں کتنی قیامتیں نہ ٹوٹی ہوں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ شعر و ادب کی سب سے سنگلاخ زمین شعر کا شعر میں ترجمہ کرنا ہے اور وہ بھی نہ صرف تمام تر شعری پابندیوں کے ساتھ بلکہ اصل نظم ہی کے فارم میں۔

ہم جانتے ہیں کہ ادب عالیہ میں ایک ایک لفظ جس مقام پر جڑا ہوا ہے اس میں ذرا سا ردو بدل اس کے مفہوم و تاثر کو کس قدر متاثر کر سکتا ہے۔ اس واسطے شعری ترجمہ الفاظ کا نہیں، بلکہ اس کے مفہوم اور شعری حسن و تاثر کا کیا جاتا ہے۔ مترجم کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں اور جب وہ ترجمہ کرنے بیٹھتا ہے تو کہیں ویسے مترنم اور پر شکوہ قوافی نہیں ملتے، کہیں بندش و ترکیب راستہ روکتی ہیں، کہیں صنائع بدائع اپنی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتے ہیں کہیں ویسا صوتی آہنگ پیدا نہیں ہوتا، غرضیکہ ان تمام مراحل سے گذرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک ہی زبان کے کسی ادبی شہ پارہ کے الفاظ ذرا سے ردو بدل کے متحمل نہیں ہوسکتے تو پھر وہ سارے کے سارے الفاظ جو ایک زبان سے اٹھا کر دوسری زبان میں منتقل کیے جا رہے ہوں اپنا سارا حسن و تاثر بھلا کیونکر برقرار رکھ سکتے ہیں۔ یقیناً بہت کچھ چھوٹ جاتا ہے اور اس کمی کو دوسری زبان کی شعری لطافتوں سے اور سب سے بڑھ کر مترجم کو اپنے جمالیاتی شعور سے نہ صرف پورا کرنا بلکہ حتی الوسع اضافہ بھی کرنا ہوتا ہے۔ مترجم کو شعر جیسی لطیف تخلیق کا مترجم ہی نہیں تخلیق کار بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور جب ترجمہ

اور تخلیق ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو بے چارہ "ترجمہ" شاہانہ مزاج "تخلیق" کا ادنیٰ غلام بن کر رہ جاتا ہے اور اس "ترجمہ کم تخلیق" کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے ہر آزادی جائز ہو جاتی ہے۔ یہی اصول خیام کے مترجم فزجیرالڈ کے یہاں کارفرما ہے اور اسی کی پیروی میں نے بھی کی ہے۔

عام طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ترجمہ اپنے اصل کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ مگر فزجیرالڈ کے تراجم اس مفروضہ کی قطعی نفی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خیام کی مندرجہ ذیل رباعی اور اس کا منظوم انگریزی ترجمہ بصورت رباعی ملاحظہ فرمایئے اور فیصلہ خود کر لیجئے کہ کون زیادہ خوبصورت ہے۔ "اصل" یا اس کا "ترجمہ"

گر دوست دہد ز مغز گندم نانے
وز میکدہ ای بہ گو سفند را نے
وانگہ من و تو نشستہ در ویرانے
عیشے بود آں زحد ہر سلطانے

Here with a book of verse beneath the bough,

A loaf of bread, a jug of wine and thou

Beside me singing in the wilderness:

And the wilderness is a paradise enow!

یہاں پر یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ کسی زبان کے صرف ایک شاعر کے کلام کو دوسری زبان میں بصورت شعر منتقل کرنے میں مترجم کے قلم میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے، جبکہ مختلف ادوار کے مختلف النوع شعراء کے رنگا

رنگ کلام کو ان ہی کے انداز میں ایک غیر زبان میں منتقل کرنا کسی ایک ہی قلم کے لئے از حد دشوار ہوتا ہے۔ بہرحال اس بو قلمونی میں مترجم کو اپنا راستہ آپ بنانا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی مغربی شعراء کو مشرقی انداز میں اپنی طرز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون مغرب کا ہے اور انداز بیاں مشرق کا۔ ان تراجم میں شعرائے مغرب کے مختلف ادوار کی زبان اور زبان کی ارتقائی تبدیلیاں نہیں دیکھی جاسکیں گی۔ یہاں چودھویں صدی کے چاسر اور بیسویں صدی کے ایلیٹ کی زبان میں فرق نظر نہ آئے گا۔ البتہ انداز بیان کے فرق کو ممکن ہے کہ کسی حد تک محسوس کیا جاسکے۔

شاعری خواہ کسی زبان کی ہو بڑی حسین اور دلکش ہوتی ہے۔ انگریزی شاعری بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ جو رہنما اصول مشرق نے اپنی شاعری کے لئے مقرر کئے ہیں، وہی یہاں بھی کارفرما ہیں۔ وہی ذوق جمالیاتی، وہی اثر انگیزی، وہی نغمگی، وہی صوتی دلاویزی، وہی مضمون آفرینیاں، وہی نازک خیالیاں، وہی تشبیہات و استعارات کی رنگینیاں، اور سب سے بڑھ کر۔

عشق کا درد وہی، حسن کا جادو بھی وہی

البتہ جس طرح دیس دیس کے طور طریقے رسم و رواج الگ الگ ہوتے ہیں عروس سخن کو بھی دست مشاطہ نے اپنے روایتی انداز میں سنوارا۔ مغرب نے مغربی طرز پر اس کا روپ نکھارا تو مشرق نے اپنی کرشمہ سازیوں سے اس کے حسن کو چار چاند لگائے۔ بہرحال پیکر حسن کو جس لباس میں آراستہ کیا اس کی جامہ زیبی نے اس کی بلائیں لیں۔

ہماری اردو شاعری نے اپنی روایات و تلمیحات عربی اور فارسی سے اخذ کیں

اور ہمارے اساتذہ شعراء ان زبانوں کے کلاسیکی شعر و ادب سے استفادہ کرتے رہے اسی طرح مغربی شاعری کا رشتہ یونانی اور لاطینی سے جا ملتا ہے اور مغربی شعراء بشمول برطانوی شعراء یونانی اور لاطینی ادبیات سے رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود مشرقی اور مغربی شاعری میں بڑی حد تک یکسانیت اور مماثلت موجود ہے جس کے ثبوت میں دور کیوں جایئے ان ہی تراجم کی اصل نظموں کو دیکھ لیجئے۔ یہ نظمیں اپنے تخلیق کاروں کی شاہکار نظموں میں شمار ہوتی ہیں اور بیشتر گولڈن ٹریژری سے لی گئی ہیں۔ ان کو دیکھنے سے حسب ذیل شواہد سامنے آتے ہیں۔

۱) یہ سب کی سب پابند شاعری میں ہیں جن میں مشرقی شاعری سے بھی کہیں زیادہ سختی سے اوزان و قوافی کی پابندی کی گئی ہے۔
۲) مشرقی اصناف سخن میں سے مثنوی پر یہاں بھی اکثر مشق سخن کی گئی ہے۔
۳) عروض میں ''فعلن'' کی بحر یہاں بھی مستعمل ہے اور اگر انگریزی الفاظ کو ان کے صحیح تلفظ اور اہل زبان کے لہجہ میں ادا کیا جائے تو اکثر انگریزی مصرعوں کی تقطیع اس مشرقی بحر میں کی جاسکتی ہے۔
۴) ایک ہی نظم میں وزن کے رکن گھٹائے اور بڑھائے جاسکتے ہیں مگر ایسی صورت میں کسی باقاعدگی کا التزام ضروری ہوتا ہے۔ یہ انداز ہماری مشرقی شاعری میں بھی کوئی نیا نہیں۔ ہماری روایتی شاعری میں مستزاد اس کی مثال موجود ہے۔
۵) ہمارے بہت سے اصناف سخن جیسے مربع، مخمس، مسدس وغیرہ یہاں بھی عام ہیں۔ البتہ ان کی وضع قطع کچھ بدلی ہوئی ہے۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ تاثر کہ انگریزی میں قحط قوافی ہے اور یہ کہ

اوزان کی یکساں ہم آہنگی اور قوافی کی تکرار سے ایک جیسی پیدا ہونے والی جھنکار مغربی مزاج شاعری پر گراں گذرتی ہے، قطعی بے سروپا اور محض بے بنیاد ہے۔

انگریزی شاعری میں مروج چند اصناف سخن جو مشرقی شاعری کے لئے اجنبی ہیں یہاں متعارف کرانا ضروری ہیں۔

(1) SONNET (سانٹ) : یہ صنف سخن مغرب میں بے حد مقبول رہی ہے۔ اس میں کسی خوبصورت خیال کا اظہار مناسب اختصار اور مترنم انداز میں کیا جاتا ہے۔ سانٹ پر عروض کی دو پابندیاں عائد ہیں۔ پہلی یہ کہ سانٹ صرف چودہ لائنوں کا ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ سانٹ صرف ایک مخصوص وزن (آئمبک پینٹا میٹر) (Iambic Pentameter) میں ایک مخصوص رائم اسکیم میں لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ مختلف ادوار میں اس کی رائم اسکیم میں ردو بدل ہوتا رہا ہے۔ سانٹ سولھویں صدی سے دور حاضر تک مروج رہا ہے اور سب ہی ممتاز شعراء نے اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ امریکی شعراء نے شاید اس کی پابندیوں کے سبب اس سے اجتناب کیا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ہمارے بعض شعراء نے اسے اردو شاعری میں متعارف کرانے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

(2) ODE (اوڈ) :- یہ صنف سخن بھی انگریزی شاعری میں بے حد مقبول رہی ہے۔ اس میں شاعر عموماً کسی تصوارتی بے جان شے سے مخاطب ہو کر اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ اوڈ کے اسٹنزوں میں لائنوں کی تعداد متعین نہیں مگر پہلے اسٹنزے میں جس رائم اسکیم کو اختیار کر لیا جاتا ہے اس کی پابندی آخر تک لازمی ہو جاتی ہے۔ اس کے مصرعوں میں بڑی نغمگی ہوتی ہے اور

شاعر دل کھول کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دور حاضر میں یہ صنف تقریباً متروک ہو چکی ہے۔

(3) BLANK VERSE (بلینک ورس) : یہ قوافی کی قیود سے آزاد صرف ایک مخصوص بحر آئمبک پینٹا میٹر کی پابندی کرتی ہے۔ بلینک ورس ایک لحاظ سے ہماری نثر مرجز ہے جس میں فقط وزن کی پابندی کی جاتی ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو صنف اہل مشرق کی نظر میں نثر کی ایک قسم ہے اہل مغرب نے اسے نظم کے زمرے میں شمار کیا۔ چونکہ فاصلے مشرق و مغرب کے ہیں اس لئے اسے نظر کا دھوکہ کہہ لیجئے یا سائنسی اصطلاح میں Parallax Error۔

نثر مرجز کا ذکر آگیا ہے تو ایک نمونہ نثر مرجز کا بھی دیکھ لیجئے جو "بحر الفصاحت" مولفہ محمد نجم الغنی خاں رامپوری مطبوعہ نو لکشور پریس لکھنؤ طبع دوم 1927ء صفحہ 1119 سے لیا گیا ہے۔ مولف ہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

مرجز وہ نثر ہے جس میں وزن شعر ہو اور قافیہ نہ ہو۔ یہ قسم بہت کم پائی جاتی ہے۔ اردو میں آغا غنی کی یہ نثر جس کا وزن مفعول مفاعیلن ہے' یہ نثر انتخاب یادگار مولفہ امیر مینائی کی تقریظ میں سے ہے۔ نثر

"دیوان حقیقت کے مطلع کے ہیں دو مصرعے اک حمد الٰہی ہے اک نعت پیغمبرؐ ہے۔ اس مطلع روشن کے معنی منور سے ہر ذرہ بھی ہے واقف۔ سنتے ہیں ازل سے سب یہ مطلع نورانی پر اس کے سوا اب تک اس ساری غزل میں سے ایک شعر نہیں پایا لیکن مجھے ہاتھ آیا اس وقت غنی موقع میں سب کو سناتا ہوں اس مطلع یکتا کا جو حسن ازل سے ہے۔ اس وقت موافق میں کیونکر نہ ثناخواں ہوں۔ سامان غزلخوانی کیا خوب مہیا ہے۔ دربار میں حاضر ہیں نقاد زر معنی عالم کو سخن میرا سننے کی تمنا ہے"

کتاب مذکور میں "سہ نثر ظہوری" سے بھی نثر مرجز کا ایک نمونہ فارسی کا پیش کیا گیا ہے۔ جس میں "مفعول مفاعیلن" کی بجائے ایک دوسرا وزن استعمال ہوا ہے جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نثر مرجز میں کوئی سا وزن استعمال ہوسکتا ہے مگر انگریزی بلینک ورس میں سانٹ کی طرح سوائے آئمبک پینٹا میٹر کے کسی اور وزن کی اجازت نہیں ہے۔ سخن شناس بحر کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں کہ کس طرح کوئی شعر کسی خاص بحر میں ہونے کی وجہ سے زیادہ پرکشش اور پر تاثیر ہوسکتا ہے۔ یا کن تاثرات کو شعر میں ادا کرنے کے لئے کون سی طرز ترنم زیادہ موزوں ہوسکتی ہے۔ انگریزی بلینک ورس کا میٹر بھی انتہائی مترنم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت پرسوز اور پراثر ہے جس کے سبب قافیہ کی تلافی ہوجاتی ہے اگرچہ لفظ "بلینک" اپنی کمی پر آپ گواہ ہے۔ مگر اس کو کیا کہئے کہ انگریزی شعروادب میں ایسی ایسی کوہ پیکر ہستیوں نے اس بے مایہ کو اپنی گراں مایہ تخلیقات سے مالا مال کر دیا۔ بلینک ورس صدیوں سے انگریزی مزاج سخن میں رچ بس گئی اور اسے ادب عالیہ میں ایک منفرد مقام حاصل ہوگیا۔

یہ موضوع تشنہ رہ جائے گا اگر چند الفاظ فری ورس اور پروز پوئم کے بارے میں نہ عرض کر دیئے جائیں۔ انیسویں صدی تک تو بلینک ورس تمام تر پابندیوں کے ساتھ لکھی جاتی رہی مگر بیسویں صدی میں جدت پسند طبیعتوں نے پینٹا میٹر کی پابندی ختم کر کے دیگر مروجہ بحروں میں بھی "بلا قافیہ نظم" لکھنے کی آزادی لے لی اور اسے فری ورس کا نام دیا گیا۔ بعد کو تمام قیود سخن کو بالائے طاق رکھ کر "شاعری" ایجاد کی گئی۔ چونکہ ان کی یہ شاعری نظم کی بجائے نثر ہو کر رہ گئی تھی اس لئے اسے "پروز پوئم" (نثری نظم) کہنے لگے۔ مغربی مزاج سخن صدیوں سے بلینک ورس سے مانوس تھا اس لئے وہاں اس غیر پابند شاعری

کے لئے فضا ساز گار تھی اور بعض اہل قلم نے اس میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور شہرت پائی۔ ہمارے یہاں بھی اس طرز نو کی تقلید ہوئی اور گزشتہ چند دہائیوں میں ہمارے جدت پسندوں نے نثری نظم کا خوب پرچار کیا اور اپنا زور قلم آزمایا۔ مگر ہمارے مشرقی مزاج نے اسے قبول نہیں کیا اور آہستہ آہستہ نثری نظم کا زور شور ٹھنڈا پڑ گیا۔ نثری نظم پر تبصرہ یا تنقید ان صفحات کا موضوع نہیں۔ یہ چند باتیں محض عام معلومات کے لئے لکھی گئی ہیں۔

اور اب چاسر (۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء) سے ایلیٹ (۱۸۸۸ء تا ۱۹۶۷ء) تک سات صدیوں پر محیط مرقع شعرو سخن کی ایک جھلک ملاحظہ ہو، مگر بقول شاعر ؎

ٹھہرو، چلتے ہیں سیر گلشن کو، رواں
پہلے دلوں میں بہار پیدا کر لیں

GEOFFERY CHAUCER

جیوفرے چاسر
(۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء)

چاسر کو انگریزی شاعری کا باوا آدم مانا جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ انگریزی کا پہلا شاعر ہے۔ اس سے پیشتر بھی کئی قابل ذکر شعراء گذرے ہیں جن کے نام تاریخ میں محفوظ اور نمونہ کلام بھی موجود ہیں مگر اس دور کی زبان اس قدر بدل چکی ہے کہ آج کے قاری خصوصاً مشرقی قاری کے لئے اجنبی اور نافہم ہے۔ علاوہ ازیں ان کی تخلیقات کا بیشتر حصہ ماضی کی دبیز تہوں میں دب گیا البتہ چند جزئیات ان کے نام سے موسوم ہیں۔ اس کے برعکس چاسر کا سارا کلام موجود ہے۔

چاسر اپنے عہد کے ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ شاہ برطانیہ ایڈورڈ سوئم کے درباریوں میں تھا۔ اس عہد کی درباری زبان فرانسیسی تھی۔ اطالوی کو علمی و ادبی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔

چاسر نے اپنی شاعری کی ابتداء فرانسیسی سے کی پھر اطالوی میں شعر کہے اور پھر اپنے ملک کی زبان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اطالوی اور فرانسیسی اساتذہ سے استفادہ کیا تھا اس لئے ان کے کئی شاہکار انگریزی میں منتقل کئے اس کے

عہد میں سارے یورپ کا مذہب رومن کتھولک عیسائیت تھا اس لئے پورے براعظم کا ایک سا معاشرہ تھا ان کے آئین سپہ گری اور آداب معاشرت بھی ایک تھے۔ نتیجتاً ان کے مزاج شاعری میں بھی یکسانیت اور ہم آہنگی تھی جس کے سبب چاسر کی زندگی ہی میں اس کی شاعری کی دھوم برطانیہ سے نکل کر فرانس، اٹلی اور دوسرے یورپی ممالک تک جا پہنچی تھی۔

چاسر نے اپنی تخلیقات کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان میں "دی کنٹربری ٹیلز (The Canterbury Tales) خاص طور پر مشہور ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چاسر نے اس کے ذریعہ اپنے عہد کے انگلستان کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ اس میں قصے کہانیوں کے علاوہ مختلف طبقے اور پیشے کے لوگوں کی جھلکیاں بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اسی قسم کی ایک نظم "دی اسکوائر" (The Squire) کا منظوم ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔ شاعر کے اسلوب بیان اور شگفتگی زبان کے ساتھ ساتھ اس عہد کے انگلستان کے معاشرے، آداب و اطوار رہن سہن کا انداہ لگائیے اور پرانی مشرقی اقدار سے موازنہ فرمائیے۔ واضح رہے کہ چاسر حافظ شیرازی (وفات 1390ء) کا ہمعصر ہے۔

جیوفرے چاسر

اسکوائر

(آزاد ترجمہ)

ذکر ہے اک امیر زادے کا
جان و دل اپنے خانوادے کا
باپ نائٹ ہے، آپ اسکوائر
کھولے پر زیر تربیت طائر
ایک دو بار باپ کے ہمراہ
دیکھ آیا ہے دور سے جنگاہ
عمر اس کی ابھی ہے بیس برس
کھڑی تقدیر جھل رہی ہے مگس
قد میانہ، بھرے بھرے بازو
اک سجیلا جوان ہے گبرو
گھونگھریالے سنہرے اس کے بال
اس پہ مشاطگی بہ حد کمال
پھولدار اس کا شوخ رنگیں کوٹ
اور اس پر سنہری سرخ ہے گوٹ

بیل بوٹے کڑھے ہیں لاتعداد
وضع مردانی کم، زنانی زیاد
ناچ گانے کا اس قدر شوقین
رات بھر گائے اور بجائے بین
جانتا ہے وہ راگ راگنی سب
اور چہکتا ہے جیسے بلبل شب
ہے فنون سپہ گری میں طاق
شہسواری میں بھی بڑا مشاق
ہے سخن فہم بھی وہ اک باذوق
اور ہے فن مصوری کا بھی شوق
ہے طبیعت عجیب باغ و بہار
خوش بیاں، خوش مزاج، خوش گفتار
گرچہ ناکتخدار ہے نام خدا
دل ہے اک دلربا کو دے بیٹھا
جب کبھی اس کے سامنے جاتا
کورنش جھک کے ہے بجا لاتا
الغرض یہ جوان ہمہ صفات
چین سے ہے گذارتا دن رات
قبلہ گاہی کے ساتھ ہوتا ہے جب
کھول سکتا نہیں ہے اپنے لب

SIR THOMAS WYATT
(1503-1542)

سر ٹامس واٹ

پندرھویں صدی عیسوی تاریخ برطانیہ میں شعر و ادب کی تخلیق کے لحاظ سے بنجر صدی (Barren Century) کہی جاتی ہے جس نے کوئی قابل ذکر شعرا پیدا نہیں کئے۔ سولھویں صدی نے البتہ اس کمی کو پورا کر دیا اور بہت سے نامی گرامی شعرا پیدا کئے۔

اوائل سولھویں صدی میں ٹیوڈر خاندان کے بانی حکمراں ہنری ہفتم کو اپنی حکومت مستحکم کرنے کے باعث فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس کے جانشین ہنری ہشتم (1547-1509) نے جو خود بھی شاعر تھا شعر و ادب کی قدر دانی کی۔ واٹ اسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اٹلی اور اسپین میں برطانوی سفیر رہا۔ ایک سفیر کی یہ دلچسپ تعریف واٹ ہی سے موسوم ہے۔

"An ambassador is a gentleman who *lies* abroad for the good of his country."

اس نے کئی اصناف سخن میں جو اطالوی شاعری میں مروج تھیں انگریزی میں طبع آزمائی کی۔ ان میں سانٹ کو انگریزی شاعری میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گویا انگریزی شاعری میں سانٹ کو متعارف کرانے کا سہرا واٹ کے سر ہے۔

واٹ کے ایک سانٹ کا منظوم ترجمہ بصورت سانٹ ملاحظہ ہو۔

سرٹامس واٹ

جنونِ عشق

(آزاد ترجمہ)

اے جنون عشق، تجھ کو دور سے میرا سلام
اب گرفتار ہوس ہرگز میں ہو سکتا نہیں
ہاں یہ سچ ہے آگیا تھا تجھ پہ مجھ کو بھی یقیں
جب دیا پہلی پہل تو نے مجھے اپنا پیام

اور آنکھیں بند کر کے میں بہ صدق و احترام
تھا سمجھ بیٹھا تجھے سرمایہ دنیا و دیں
اور پھر تو نے مری جانب سے نظریں پھیر لیں
آہ اے ننگ وفا! ہے بیوفائی تیرا نام

اے جنون عشق! اب مجھ کو نہ جان اپنا اسیر
ہیں بہت سے نوجواں، کر ان پہ تو مشق ستم
کردے خالی اپنا ترکش، رہ نہ جائے کوئی تیر
دیدے اپنا غم انہیں رکھتے نہ ہوں جو کوئی غم

کیونکہ میرے پاس تیرے واسطے فرصت کہاں
شوخ تر تجھ سے ہیں قرطاس و قلم کی شوخیاں

EDMUND SPENSER

(1562-1599)

ایڈمنڈ اسپنسر

اسپنسر انگریزی شاعری میں بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ اسے "شاعروں کا شاعر" (Poet's poet) کہا جاتا ہے۔ وہ لندن کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ کیمبرج میں تعلیم پائی۔ اسے یونانی' لاطینی' اطالوی اور فرانسیسی پر بھی عبور تھا۔ کچھ عرصہ اپنے دوست سرفلپ سڈنی کی خواہش پر وہ اس کے ساتھ رہا۔ 1580ء میں سڈنی کے انگلینڈ سے جلاوطن کئے جانے پر اسپنسر آئرلینڈ چلا گیا جہاں بعض امراء کے درباروں سے منسلک رہا۔ 1589 میں سروالٹر ریلے اس کی ملاقات کو آیا اور اس کی طویل نظم (The Faerie Queene) کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا جس کی تین جلدیں اس وقت تک لکھی جا چکی تھیں۔ ریلے شاعر اور اس کے مسودات کو لے کر انگلینڈ آیا۔ شاعر اور اس کی تخلیقات کو ملکہ الزبتھ اول کے حضور پیش کیا۔ ملکہ نے شاعر کو انعام و اکرام سے نوازا اور اس کی تخلیق کو شاہی اہتمام سے شائع کرایا۔ لیکن اسپنسر جو اونچی توقعات لے کر لندن آیا تھا وہ پوری نہ ہوئیں اور وہ بہت جلد بد دل ہو کر واپس آئر لینڈ چلا گیا۔ 1595ء میں اس نے (Faerie Queene) "فیری کوئن" کی مزید تین جلدیں شائع کرائیں۔

ستمبر 1598ء میں آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی۔ باغیوں نے اس کی املاک بھی نذر آتش کر دیں۔ اسپنسر خود جان بچا کر انگلینڈ بھاگ آیا اور چند ماہ بعد جنوری 1599ء میں لندن میں انتقال کیا جہاں اس کے رفقاء اور عقید تمندوں نے اسے عزت و احترام سے ویسٹ منسٹر ایبے میں دفن کیا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسپنسر کو انگریزی شاعری میں بہت بلند مقام حاصل ہے اسے "شاعروں کا شاعر" مانا جاتا ہے۔ اس کی شاعری سے بعد کے شعراء عرصہ دراز تک مستفید ہوتے رہے۔ اس کے قائم کردہ نو لائنوں کے اسٹنزے اسی کے نام سے موسوم "اسپنسیرین اسٹنز" (Spensarean Stanza) کہلاتے ہیں جن کی صدیوں پیروی ہوتی رہی۔

ان اوراق میں گولڈن ٹریژری سے ماخوذ اسپنسر کی دس اسٹنزوں پر مشتمل نظم (Prothalamion) کے فقط دو اسٹنزے نمونہ کے طور پر اردو میں پیش کئے گئے ہیں۔ اصل نظم جو دو امیرزادیوں کے جشن شادی پر لکھی گئی تھی۔ شاعر نے نو کی بجائے اٹھارہ لائنوں کے اسٹنزے مقرر کر کے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی دو اسٹنزے اسی رائم اسکیم میں ہدیہ ناظرین ہیں۔

ترجمہ

اے خوشا روز!

اے خوشا روز کہ رقصندہ بہاریں ہر سو
غنچہ و گل کو صبا دیتی ہے پیغام طرب
مہر تاباں کی حرارت میں حلاوت ہے عجب
نقرئی ٹیمز کی موجوں نے کیا وہ جادو
کہ مجھے کھینچ بلایا لب جو
دور تک ساحل دریا کا نظارہ ہے غضب
سبزہ و گل پہ وہ گلکاری نقاش ازل
جگمگاتے ہوئے جیسے مہ و انجم دم شب
فکر شاعر گئی اوزان و قوافی میں جو ڈھل
خود بخود ہوگئی اک تازہ غزل
شعر آگیں وہ فضائیں' وہ سہانا منظر
بربط طبع پہ شاعر نے کیا صرف ہنر
ساز چھیڑا نئے عنواں سے جو بہر تمہید
وہ سماں باندھا لگی جھومنے ہر شاخ شجر
دی حسینان چمن نے یہ نوید
کہ مبارک ہو یہ تقریب سعید
ٹیمز کی موجو! مرے ساز پہ دف اپنے بجاؤ
ہے خوشی کا یہ محل' گیت خوشی کے گاؤ

پُر فضا باغ جو ہے ساحل دریا کے قریں
رنگ و بو کا ہے فقط آج وہاں دخل و عمل
درمیاں پھولوں کے سبزے نے بچھا دی مخمل
غول پریوں کا اک اترا ہے وہ شوخ و شیریں
کہ خجل چرخ پہ ماہ و پرویں
ہر ادا جن کی مچاتی ہے دلوں میں ہلچل
ہر روش پر ہیں خراماں وہ غزالان ختن
وہ سنواری ہوئی زلفوں سے ڈھلکتے آنچل
وہ ہر اک پھول سے چہرے میں کھلا ایک چمن
جس پہ صدقے ہو بہار گلشن
ٹوکری پھولوں کی ہاتھوں میں لئے چنتی ہیں پھول
کرتی ہر شاخ چمن سے ہیں خراج اپنا وصول
نور نرگس سے، حیا غنچے سے، لالے سے لہو
مرحبا حسن چمن، حسن نظر، حسن قبول
شوخ و رنگیں وہ لئے جام و سبو
ناز سے ہیں وہ خراماں ہر سو
ٹیمز کی موجو! مرے ساز پہ دف اپنے بجاؤ
ہے خوشی کا یہ محل، گیت خوشی کے گاؤ

CHIRSTOPHER MARLOWE
(1564-1593)

کرسٹو فرمارلو

کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر تئیس (۲۳) برس کی عمر میں اس نے اسٹیج کا رخ کیا اور اپنا پہلا ہی ڈرامہ "ٹیمبرلین" (Tamberlane) پیش کر کے تہلکہ مچا دیا۔ چھ سال کی قلیل مدت میں تقریباً نصف درجن ڈرامے پیش کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور زور بیان کا سکہ بٹھا دیا۔ لیکن برطانوی افق پر طلوع ہونے والا یہ روشن ستارہ ابھی پوری طرح اپنی آب و تاب دکھانے بھی نہ پایا تھا کہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اس کی جوان موت پر اس کے معاصر ڈرامہ نگاروں نے عرصہ تک برطانوی اسٹیج پر اس کا ماتم کیا۔

گذشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ مغربی شعرو ادب یونانی اور لاطینی روایات اور تلمیحات سے عبارت ہے۔ قدیم یونانی گلہ بانوں کی سادہ زندگی، خلوص و پاکیزگی سی رچی بسی، سچی خوشیوں سے بھرپور، شعرائے مغروب کے نزدیک مثالی شاعرانہ ماحول تھا۔ اس کے تصور سے شعراء اپنے دلوں کو گرماتے اور اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار کیا کرتے۔ یہ موضوع سخن اس قدر مقبول ہوا کہ اسے (Pastoral) "شبانی شاعری" کے منفرد نام سے پکارا جانے لگا۔ یہاں مارلو کے ایک گیت کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو شبانی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔

ہم تم

(مارلو کے گیت کا آزاد ترجمہ)

ان وادیوں، ان کہساروں میں
ان مہکے سبزہ زاروں میں
ان دلکش حسیں نظاروں میں
رنگیں پر کیف بہاروں میں
آؤ، ہم تم اک ساتھ رہیں
ہر دکھ سکھ ہم تم ساتھ سہیں

یہ جنگل، کھیت، چراگاہیں
یہ جانی پہچانی راہیں
پھیلائے ہوئے اپنی باہیں
کس پیار سے بھرتی ہیں آہیں
آؤ، ہم تم اک ساتھ رہیں
ہر دکھ سکھ ہم تم ساتھ سہیں

تم راج کرو گھر بیٹھی یہاں
میں بھیڑیں چراؤں تمہاری وہاں
گاتی ندی بہتی ہے جہاں
اور بولے پپیہا، "پی کہاں!"
آؤ ہم تم اک ساتھ رہیں
ہر دکھ سکھ ہم تم ساتھ سہیں

میں لاؤں تمہارے لئے جوڑا
شادی کا ایسا بیش بہا
خالص سونے سے کڑھا ہوا
ہو جس کا ہر اک گل بوٹا
آؤ ہم تم اک ساتھ رہیں
ہر دکھ سکھ ہم تم ساتھ سہیں

وادی کے سارے گلہ باں
اور گاؤں کے زندہ دل دہقاں
اس شادی کے ہوں گے مہماں
گائیں گے خوشی کے گیت یہاں
آؤ، ہم تم اک ساتھ رہیں
ہر دکھ سکھ ہم تم ساتھ سہیں

WILLIAM SHAKESPEARE

(1564-1616)

ولیم شیکسپیئر

ولیم شیکسپیئر انگلستان کا مایہ ناز شاعر اور ڈرامہ نگار ایک چھوٹے سے قصبے اسٹرٹ فورڈ میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم پائی۔ وہ معمولی تعلیم یافتہ تھا۔ جوانی میں روزی کمانے لندن آیا۔ جہاں ایک تھیٹر میں ملازم ہوگیا۔ پھر ایکٹر بن گیا اور کچھ عرصہ بعد میں تھیٹر کے لئے ڈرامے لکھنے لگا۔ ۱۵۹۴ء تک اس کو اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ لندن کے ایک مشہور تھیٹر کا حصہ دار بن گیا۔ وہ اپنی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو اپنے ڈراموں میں اجاگر کرتا رہا جو آج انگریزی ادب عالیہ میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں۔ لگاتار محنت نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا اور ۱۶۱۰ء میں جبکہ اس کی عمر چھیالیس (۴۶) برس کی تھی اس نے تمام مصروفیات ترک کر کے خانہ نشین ہوجانے کا فیصلہ کیا اور اپنے آبائی قصبہ اسٹرٹ فورڈ میں سب سے عمدہ مکان خرید کر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی جہاں ۱۶۱۶ء میں انتقال کیا۔

برطانوی شعراء میں جو عالمی شہرت شیکسپیئر کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ نصیب ہوئی اس کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے مشہور انگریز مصنف

میکالے کے یہ الفاظ کافی ہوں گے کہ

"قدرت نے مجھے انگلستان میں پیدا کر کے جن بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں میرے نزدیک سرفہرست یہ ہے کہ میں شیکسپیئر کو اپنی مادری زبان میں پڑھ سکتا ہوں۔"

ذیل میں شیکسپیئر کے دو سانٹوں کا ترجمہ اسی کے نام سے موسوم " شیکسپیئر ین سانٹ" کے فارم میں پیش کیا گیا ہے۔ گولڈن ٹریژری میں شیکسپیئر کے جن سانٹوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی ابتداء انہی سے کی گئی ہے۔

وقت

یوں نظر آتے ہیں وہ مرحوم ماضی کے مزار
عظمتِ رفتہ کے وہ تابوت بے نام و نشاں
ریگ زارِ وقت پر پس خوردہ لیل و نہار
جیسے چھوڑ آیا ہو پیچھے اک گزرتا کارواں

معرکہ آرا ہیں کچھ اس طرح باہم خشک و تر
ہے ادھر یلغار موجوں کی' تو اس جانب زمیں
مسکراتی ہے انہی گہرائیوں کو پاٹ کر
جیت میں ہار' الاماں! اور ہار میں جیت' آفریں!

سرحدیں بنتی بگڑتی ہیں یہاں شام و پگاہ
پر نہیں تبدیل ہوتی سرحدِ ملکِ عدم
وسعتوں میں وقت کی اپنی بناتے آپ راہ
خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں اس جانب قدم

اور چھپا لیتا ہے منہ جب تیرگی میں آفتاب
بُوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب'

ماورائے وقت

سنگ و آہن کیا، ہیں بر و بحر بھی زار و زبوں
وقت سب کو روندتا جاتا ہے زیرِ ماہ و سال
حشر ساماں حسن کا چلتا نہیں کوئی فسوں
دم میں رہ جاتا ہے مرجھا کر گلِ تر کی مثال

رنگ و بو کے نازک ان ہاتھوں سے کیا فصلِ بہار
روک سکتی ہے قدم بڑھتے ہوئے سوئے خزاں
وہ قدم، حائل نہ جن کی راہ میں کوئی حصار
آہن و فولاد جن کے سامنے بے جسم و جاں

گوہرِ نایاب کیا کیا مال مفت اپنا بنائے
جا رہا ہے وقت ڈگ بھرتا کس اطمینان سے
ہے کوئی اپنی متاع ہاتھوں سے جو اس کے چھڑائے
روک لے اس کے قدم آگے جو بڑھ کر شان سے

دی یہ ہاطف نے صدا شاعر کو، اے معجز رقم
ماورائے وقت ہے تیرا یہ اعجاز قلم

سترھویں صدی کے برطانوی شعراء

سولھویں صدی کے نصف آخر کے برطانوی شعراء نے ملکہ الزبتھ اول کے سنہری عہد میں انگریزی شاعری کو ان بلندیوں تک پہنچا دیا جہاں اس دور کے یورپ کی بعض معاصر زبانیں اپنے شعرو ادب کے گرانقدر سرمایہ کی بدولت موجب وجدان اور سرچشمہ فیضان سمجھی جاتی تھیں۔ یہ منازل کچھ ایسی دھن اور لگن سے طے ہوئے کہ بعد کے آنے والے شعراء بھی اسی جوش اور جذبے سے سرشار رہے اور سترھویں صدی کا بیشتر حصہ جو سیاسی انفراتفری' خانہ جنگی اور کشت و خون سے داغدار رہے' شعرو ادب کی ترویج و ترقی میں رکاوٹ نہ بن سکا۔

سترھویں صدی کے برطانوی شعری افق پر نظر ڈالئے تو اختران سخن کی ایک جگمگاتی کہکشاں نظر آتی ہے۔ اوائل صدی میں ڈون (Donne) بین جونسن (Ben Jonson) ہربرٹ (Hertert) وسط صدی میں ملٹن (Milton) شرلے (Shirley) کاؤلے (Cowley) لولیس (Lovelace) مارویل (Marvell) اور اواخر صدی میں ڈرائیڈن (Dryden) واگھان (Vaughan) اور ان کے بہت سے ممتاز معاصرین آج بھی اپنی چمک دمک دکھا رہے ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی چند شاہکار نظموں کو اردو میں منتقل کر کے شاعر کے مختصر حالات کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

JOHN DONNE
(1573-1631)

جان ڈن

وہ لندن کے ایک کٹر رومن کتھولک خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں سرٹامس مور (Sir Thomas More) مصنف یوٹوپیا (Utopia) کی پوتی تھی۔ ابتدائی تعلیم آکسفورڈ میں حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج چلا گیا۔ مگر بغیر گریجویٹ ہوئے واپس آگیا کیونکہ اس زمانے میں کیمبرج میں گریجویٹ کو جو حلف لینا پڑتا تھا وہ اس کے مذہبی عقائد سے متصادم تھا۔ چنانچہ اس نے لنکنزان (Lincoln's Inn) سے 1593ء میں بار ایٹ لاء کیا۔ 6-1595ء کے دوران اس نے اٹلی، فرانس اور بعض جزائر اطلانتک کی سیاحت کی۔ دوران سیاحت وہ نظمیں لکھتا رہا اور مذہب کا بھی بغور مطالعہ کرتا رہا جس نے اسے رومن کتھولک عقیدہ سے منحرف کر دیا اور وہ چرچ آف انگلینڈ کا مقلد ہو گیا۔

1598ء میں وہ لارڈ کیپر سرٹامس ایجرٹن (Sir Thomas Egerton) کا سیکریٹری مقرر ہوا۔ اسی اثناء میں اپنے مخدوم کی بھتیجی سے اس کا معاشقہ ہو گیا اور دونوں نے خفیہ شادی کر لی۔ اس عہد کے انگلستان کے اعلیٰ خاندانوں میں خفیہ شادی سخت معیوب اور قابل تعزیر جرم تھا۔ 1601ء میں جب یہ راز فاش ہوا تو ڈن کو نہ صرف ملازمت سے برطرف کر دیا گیا بلکہ اسے سزائے قید ہو گئی اور اس کے اثاثے بحق ایجرٹن خاندان ضبط ہو گئے۔ چودہ برس اسے انتہائی

اذیت میں گزارنے پڑے۔ بالآخر 1615ء میں بادشاہ وقت جیمز اول کی سفارش پر اس کا قصور معاف ہوا۔ اور وہ لنکنز ان میں قانون کا پروفیسر مقرر ہوا۔ 1617 میں اس کی محبوب رفیقہ حیات کا انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ اسے انتہائی شاق گذرا اور وہ تارک الدنیا ہوگیا۔ تسکین قلب و روح کے لئے اس نے مذہب کے دامن میں پناہ لی اور ہمہ وقت عبادت و ریاضت میں بسر کرنے لگا۔ 1620ء میں کلیسا نے اسے ڈین آف سینٹ پال کا اعزاز عطا کیا جس پر وہ بقیہ عمر فائز رہا۔

ڈن کو اس کی زندگی میں بحیثیت شاعر کوئی اہم مقام نہیں ملا۔ مگر بعد کے شعراء اور ناقدین نے اس کے فن پاروں کو پرکھا اور کھرا پایا۔ ڈرائیڈن اور ڈاکٹر جانسن نے اسے انگریزی کی مابعد الطبیعاتی شاعری کا امام مانا ہے۔

(Father of Metaphysical Poetry) جس کی توثیق کولرج، براؤننگ اور سوئن برن جیسی ہستیوں نے کی۔ عہد حاضر کے نقاد گریئرسن Grierson نے دل کھول کر اس کے فن کی داد دی ہے۔ ذیل میں ڈن کی دو نظموں کا منظوم ترجمہ اصل کے اسلوب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(آزاد ترجمہ)

موت

اے اجل، اترا رہی ہے تو کہ سن کر تیرا نام
دل دہل جاتے ہیں، پر مجھ کو نہیں لگتا ہے ڈر
تو بظاہر مارتی، لیکن ہے کر دیتی امر
موت ہی تو زندگی کو ہے عطا کرتی دوام
خواب بھی تو ہے پلا دیتا ہمیں ایسا ہی جام
جس کی لذت سے ہیں سب واقف۔ عجب کیا طرفہ تر
لذت جام اجل ہو، جو یہ رکھتا ہے اثر
عمر بھر کی ہے تھکن دم میں اتر جاتی تمام

موت، میں تجھ سے نہیں ڈرتا، میں مر سکتا نہیں!
مختصر اک خواب ہے تو، مختصر ہے جس کی حد
اور اس کے بعد بیداری مسلسل تا ابد
زندگی ہی زندگی ہے بعد مردن بالیقیں
تیرا اس عالم میں ہو سکتا نہیں دخل و عمل
تو وہاں بے موت مر جائے گی، بیچاری اجل!

فراق و وصال

اے فراق! اے کہ ترے نام سے لرزاں عشاق!
تیرے لمحات طویل
جن کی حائل ہے فصیل
کس قدر ہیں یہ گراں' کتنے گذرتے ہیں یہ شاق!
لیکن اس رہ میں جو رکھتے ہیں قدم اہل وفا
رہبری ان کی کیا کرتے ہیں خود صدق و صفا

جذبہ شوق بنا دیتا ہے ہجراں کو وصال
کیونکہ جذب الفت
ہے وہ رکھتا طاقت
حکم سے جس کے پلٹ آتے ہیں گذرے مہ و سال
وقت اور فاصلے' حتیٰ کہ حیات اور ممات
جذب صادق ہو تو ان سب کی بھلا کیا اوقات

دور ہو کر بھی' مرے دوست' ہو تم میرے پاس
ڈال کر ہاتھ میں ہاتھ
ہم ہیں دونوں اک ساتھ
کسی دوری کا نہیں ہوتا ہے مطلق احساس
بلکہ ہم وقت کے اس پار اتر جاتے ہیں
جہاں سیار و ثوابت بھی ٹھہر جاتے ہیں

BEN JONSON

(1574-1637)

بین جونسن

الزبتھ اول کے عہد کے بعد کئی قابل ذکر برطانوی شعراء گذرے ہیں۔ انہی میں بین جونسن بھی ہے۔ وہ اپنے زمانے کا ایک پڑھا لکھا شخص تھا۔ یونانی اور لاطینی کلاسیک پر اس کو عبور تھا۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک عمدہ ڈرامہ نگار بھی تھا جس کے ڈرامے انگریزی ادب میں آج بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔

اس کی شاعری کا انداز نہایت دلکش اور مترنم ہے جس نے اس کے ہموطنوں بالخصوص نئی نسل کو بہت متاثر کیا۔ اس کے عقید تمند نوجوان شعرا نے اس کے نام پر ایک انجمن "سنز آف بین" قائم کی جس کی رکنیت کے لئے حلف برداری کی باقاعدہ رسم ادا کی جاتی۔

اس عہد کے شاہ برطانیہ جیمز اول نے جسے Scholar King "عالم بادشاہ" کہا جاتا ہے۔ ایک فرمان جاری کر کے بین جونسن کو انگلستان کا ملک الشعراء (Poet Laureate of England) کا شاہی اعزاز عطا کیا۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس سے پیشتر ایسا کوئی شاہی اعزاز برطانیہ میں مروج نہ تھا اور اس حوالہ سے تاریخ انگلستان میں اس شاہی اعزاز سے پہلی بار نوازے جانے کا شرف بین جونسن کو حاصل ہے۔

یہاں بین جونسن کی ایک مشہور نظم (Hymn to Diana) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ قدیم یونانی اور رومی روایات اور دیوی دیوتا عرصہ دراز تک انگریزی شاعری پر چھائے رہے۔ یہ نظم بھی رومیوں کی "چاند دیوی" (Diana) کی شان میں ایک گیت ہے۔ قدیم رومی ڈائنا کو نور، پاکدامنی اور شکار کی دیوی مان کر اس کی پرستش کرتے اور اس کے بھجن گایا کرتے تھے۔

چاند دیوی

(آزاد ترجمہ)

خوبصورت چاند دیوی، رتھ پہ چاندی کے سوار
دوش پر اپنے سجائے نقرئی تیر و کماں
جادہ پیما دشت گردوں میں پئے سیر و شکار
اور افق سے تا افق اڑتی وہ گرد کہکشاں
گیت اس کے گا رہے ہیں چرخ پر حور و ملک
اور اسے مجرا بجا لاتی ہے رقاص فلک

چاند دیوی ہے حسینان فلک کے درمیاں
سارے سیار و ثوابت سامنے اس کے ہیں ماند
اک ادائے ناز سے تخت رواں پر ہے رواں
لیلئ شب نے لگائے اور جس کو چار چاند
پیر گردوں اس کی ہر کافر ادا سے پائمال
اک سراپا حسن ہے وہ، بدر ہو چاہے ہلال

JOHN MILTON
(1608-1674)
جان ملٹن

سترھویں صدی کے شعرائے برطانیہ میں سب سے نمایاں اور قد آور شخصیت جان ملٹن کی ہے۔ برطانیہ کا یہ مایہ ناز فرزند لندن کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ والدین نے بچپن ہی سے اس کی غیر معمولی ذہانت اور شعری رجحان کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ لائق ترین اساتذہ اسے تعلیم دینے کے لئے مقرر کیے۔ بہترین اسکول میں داخل کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ئے سات برس کیمبرج میں رکھا جہاں اس نے لاطینی اور یونانی ادبیات میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ ساتھ ہی موسیقی کی بھی باقاعدہ تعلیم دلوائی اور اسے اپنے علمی و ادبی مشاغل جاری رکھنے کے لئے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔ یہاں تک کہ سیرو سیاحت کی خاطر اور اس کے لاطینی ادبی شعور کو جلا بخشنے کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرنے کے لئے چند سال کے واسطے اٹلی بھیج دیا۔ 1639ء میں جب وہ وطن واپس آیا تو اسے اپنے زمانے کا سب سے زیادہ لائق و فائق اور باصلاحیت نوجوان تصور کیا جاتا تھا۔

یہ دور تاریخ انگلستان میں بدامنی اور سیاسی خلفشار کا دور تھا۔ شاہ برطانیہ چارلس اول اور اس کی پارلیمنٹ کے درمیان تنازعہ انتہائی سنگین صورت

اختیار کر چکا تھا۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے حامی متحارب گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور ملک میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ کبھی ایک فریق کا پلہ بھاری ہوتا تو کبھی دوسرے کا۔ ملٹن آزادی کا پرستار، مطلق العنان بادشاہت کی کیونکر حمایت کر سکتا تھا۔ وہ آزادی کے حامی پارلیمنٹ گروپ کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔ 1642ء میں جبکہ وہ آکسفورڈ شائر کا دورہ کر رہا تھا۔ جہاں بادشاہ کے حامیوں کا زور تھا اس نے وہاں کی ایک سولہ سالہ حسینہ سے شادی کرلی اور دونوں میاں بیوی لندن چلے آئے۔ لیکن ابھی ان کی شادی کو صرف چھ ہفتے گذرے تھے کہ اس کی بیوی والدین سے ملنے اپنے گھر چلی گئی اور وہاں پہنچ کر اس نے شوہر کے پاس واپس آنے سے انکار کر دیا۔ ملٹن نے بیوی کو طلاق دینے کے لئے عدالت اور کلیسا دونوں سے رجوع کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ دو برس بعد جب آکسفورڈ میں شاہی فوجوں کو شکست ہوئی تو اس کی بیوی نے معہ اپنے کنبے کے پناہ لینے کے لئے لندن کا رخ کیا اور ملٹن کے قدموں میں گر کر معافی کی خواستگار ہوئی۔ ملٹن نے اسے معاف کر دیا اور اس کے خاندان کو اپنے گھر میں پناہ دی۔

ملٹن نے سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ اپنے علمی و ادبی مشاغل ہمیشہ جاری رکھے۔ لندن میں اس کا گھر طالبان علم کا مرکز بنا رہتا۔ جنہیں وہ اپنے علم و فضل سے فیض یاب کیا کرتا۔ کثرت مطالعہ سے اس کی بینائی پر بہت برا اثر پڑا اور 1652 میں وہ بالکل اندھا ہوگیا۔ 1649 میں شاہی فوجوں کو قطعی شکست ہوگئی اور بادشاہ کا سر قلم کر دیا گیا۔ اب کرامویل کی سرکردگی میں فوج کی حکمرانی تھی۔ ملٹن کو اس کی خدمات کے صلے میں ایک اعلیٰ منصب عطا ہوا اور جب وہ قطعی اندھا ہوگیا تب بھی اسے اس منصب پر برقرار رہنے دیا گیا البتہ اس کی ذمہ داریاں بہت ہلکی کر دی گئیں۔ 1660ء میں کرامویل کے انتقال پر جب

شاہی کا دوبارہ تسلط ہوا اور مقتول بادشاہ کا بیٹا چارلس دوئم کے لقب سے تخت نشین ہوا تو ملٹن اپنے خلاف منتقمانہ کارروائی کے خوف سے روپوش ہوگیا۔ لیکن جلد ہی عام معافی کا اعلان ہوا اور حالات معمول پر آگئے تو ملٹن بھی ایک عام شہری کی طرح پر امن زندگی بسر کرنے لگا۔ اب وہ سیاست سے قطعی طور پر کنارہ کش ہو چکا تھا اور اپنے بقیہ ایام علم و ادب کی خدمت میں گزار کر 1674ء میں راہی عدم ہوا۔

ملٹن نہ صرف انگریزی بلکہ لاطینی کا بھی عظیم شاعر تھا۔ لاطینی اور یونانی ادبیات پر اس کی قابلیت مسلم تھی اور ان دونوں زبانوں کے ثقافتی ورثوں کے خزائن سے اس نے اپنی زبان کو مالا مال کر دیا۔

یہاں ملٹن کے مشہور سانٹ (On His Blindness) "اپنے نابینا ہونے پر" کا اردو ترجمہ بصورت سانٹ پیش خدمت ہے۔ ملٹن نے اپنے درد کا اظہار اپنے سانٹ میں کیا ہے۔ جبکہ میں نے اس کا صرف ترجمہ کیا ہے۔ بھلا میں اس ترجمے مین وہ تڑپ کیونکر بھر سکتا ہوں جو تڑپ ملٹن جیسے شاعر نے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کی۔ صرف "شیکسپیئر ین سانٹ" اور "ملٹو نین سانٹ" کا فرق واضح کرنا مقصود ہے۔

اپنے نابینا ہونے پر

بجھ گئے میرے چراغ آنکھوں کے اور در پیش راہ!
اب مقدر ہے یہ تاریکی جہاں کوئی کرن
پا نہیں سکتی گذر اور یہ متاعِ فکر و فن
دفن ہوجائے گی ان تاریکیوں میں آہ آہ!

لا رہا تھا میں تو تیری نذر کو، بار الٰہ
حمد کے تیری پرو کر یہ گہہائے سخن
کاش تو کرتا نہ یوں بے نور میری انجمن
لیکن اس حرفِ خطا پر میرا احساسِ گناہ

مجھ سے کہتا ہے، حقیر اک عبد کی نذرِ حقیر
جو اسی کی اک عطا ہے، اس پہ تو کرتا ہے ناز؟
اس کو کچھ تیری ثنا و حمد کی حاجت نہیں

اس کی طاعت کو ملائک، بر و بحر اس کے اسیر
شان شاہانہ ہے اس کی، پاک ہے وہ بے نیاز
ہے فقط صبر و رضا سے راضی ربُّ العالمین

اور اب ملٹن کی ایک اور نظم L' Allegro کا آزاد ترجمہ
"خوش دلی" کے عنوان سے ملاحظہ ہو

خوش دلی

اے فسردہ دلی، جا دور ہو، رونی صورت!
خوشا، اے خوش دلی! اے شوخ ادا خندہ صفت!
مسکراتی تو اسی طرح سے رہ، اے ہنس مکھ
مسکراہٹ سے تری دور دلوں کا ہر دکھ
آجا، اے خوش دلی! اور ساتھ میں اپنے لے آ
قہقہے، چہچہے، شوخی و ادا، ذہن و ذکا
ساتھ ہو تیرے وہ شہزادیوں کی شہزادی
وہ حسین دیوی جسے کہتے ہیں سب آزادی
میں بھی اے خوش دلی،ہوں تیرے پرستاروں میں
ساتھ لے چل مجھے ان وادیوں کہساروں میں
رقص کرتی ہوئی ہر سمت بہاریں ہوں جہاں
مسکراتی ہوئی ہر سو نظر آئیں خوشیاں
تاج پہنے ہوئے کرنوں کا فلک پر خورشید
ہر نئی صبح نئی خوشیوں کی دیتا ہو نوید
ہر طرف گاتے ہوئے گیت خوشی کے دہقان
اور چراگاہوں میں گونجی ہوئی وہ بانسریاں

ہو جہاں حسن و نفاست کی ہر اک شے میں نمو
اور فضاؤں میں محبت کی بسی ہو خوشبو
سادگی اور صداقت ہو جہاں کا دستور
نفرت و کذب و ریا جس کی فضاؤں سے ہوں دور
سب برابر ہوں جہاں' کوئی نہ آقا نہ غلام
نہ کسی کا ہو کسی سے کوئی اٹکا ہوا کام
ہنستے بستے ہوئے وہ پیر و جواں' مرد و زن
نیک خو' نیک سیر' نیک صفت' نیک چلن
صلح کل سب کی وضع' زندہ دلی سب کی سرشت
ایسے ماحول کو بے جا نہیں کہیئے جو بہشت
جبکہ ہوں چار طرف ایسے حسیں نظارے
طبع شاعر کے دُر افشاں نہ ہوں کیوں فوارے
بربط شعر پہ نغمات کا باندھوں وہ سماں
کہ اتر آئیں پرستان سخن کی پریاں
داد دے آرفیس[1] بھی مرے شہ پاروں کی
دھوم مچ جائے مرے ساز کی جھنکاروں کی
بسکہ اے خوش دلی! کیا بات ہے تیری' کیا بات!
کاش کر سکتا بسر عمر میں ساری ترے ساتھ

---

[1] (آرفیس ۔ یونانی دیومالا کا روایتی موسیقار جب اپنے نغمات کا جادو جگاتا تو نہ صرف وحش وطیر بلکہ شجر وحجر تک مسحور ہو جاتے)

JAMES SHIRLEY

جیمز شرلے

جیمز شرلے کو ناقدین درمیانے درجے کا ڈرامہ نگار اور شاعر شمار کرتے ہیں۔ مگر اس کی نظم (Death The Leveller) انگریزی کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم شاعر نے شاہ برطانیہ چارلس اول کے المناک انجام سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس المناک انجام کا تھوڑا ذکر ملٹن کے حالات میں ہو چکا ہے۔ اور اب شرلے کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

قدریں

(آزاد ترجمہ)

نسبت نام و نسب' شوکت و شان اسلاف
وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں قدریں ساری
زرہ بکتر نہیں برگشتہ مقدر کے خلاف
موت کا حکم ہے شاہوں پہ بھی ہوتا جاری

جائے عبرت ہے' کجا تخت کجا تختہ دار
پر مقدر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے
موت پر بس نہیں چلتا ہے کسی کا زنہار
حی وقیوم فقط ذات احد یکتا ہے

کاٹا جاتا ہے کوئی کھیت جو شمشیروں سے
ہے لہو سے لہک اٹھتا وہاں تازہ اک باغ
آزمائی ہوئی پھر ان کی ہی تدبیروں سے
گل وہ کھلتے ہیں کہ ہو جاتا ہے گل ان کا چراغ

دیر ہو سکتی ہے پر ہو نہیں سکتا اندھیر
یہی دستور زمانے کا' یہی جگ کی ہے ریت
جو زبر آج ہیں' ہو جائیں گے کل وہ بھی زیر
جیت میں ہار کبھی' اور کبھی ہار میں جیت

فتح کے پھول کوئی دم میں ہیں مرجھا جاتے
سر فاتح بھی یہاں ہوتا ہے نیزے پہ بلند
پر جو ہرگز کسی عنوان نہیں کمہلاتے
حق وانصاف کے وہ پھول ہیں حق کی سوگند

COL. RICHARD LOVELACE

(1618-1658)

کرنل رچرڈ لولیس

ملٹن کے معاصرین میں کرنل رچرڈ لولیس بھی قابل ذکر ہے۔ وہ جنوبی انگلستان کے علاقہ کینٹ کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوا۔ آکسفورڈ میں تعلیم مکمل کی اور دربار شاہی سے منسلک اعلیٰ مناصب پر فائز رہا۔ بعد ازاں شاہی فوج میں کرنل کی حیثیت سے کئی معرکوں میں بادشاہ کے ہمرکاب رہا۔ کہتے ہیں وہ اپنے زمانے کا بڑا وجیہہ صورت نوجوان تھا۔

یہاں لولیس کی مشہور نظم (To Althea From Prison) کا منظوم ترجمہ اوریجنل رائٹ اسکیم میں ہدیہ ناظرین ہے۔ یہ نظم شاعر نے انگلستان کی خانہ جنگی کے دوران قید خانے میں لکھی تھی جہاں کچھ عرصہ سیاسی وجوہ کی بناء پر وہ اسیر رہا تھا۔ یہ نظم بڑی پر سوز ہے اور انگریزی کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔

(To Althea From Prison)

(آزاد ترجمہ)

زنداں سے اپنی محبوبہ کے نام

یہ سلاخیں، یہ قفل، یہ زنداں
پھر بھی تم مجھ سے کس قدر ہو قریب
تجھ سے شیریں ہے تلخیِ ہجراں
اے مری غمگسار، یادِ حبیب
میں تری زلفِ عنبریں کا اسیر
ہوں ہر اک قید و بند سے آزاد
میرے جذبِ جنوں کی یہ تاثیر
دے رہی ہے مجھے مبارک باد

کتنی زنداں کی بدمزہ ہے شراب
اس سے بہتر ہے ٹیمز کا پانی
مگر از راہ خاطرِ احباب
پیتے مل بیٹھ کر ہیں زندانی
اور کرتے ہیں اہلِ زنداں جب
جام صحت یہاں کوئی تجویز
میں ترا نام لے کے زیرِ لب
راز رکھتا ترا ہوں جاں سے عزیز

بلبل بے نوا، اسیر قفس
کتنا پر سوز ہے ترا یہ ساز
بج رہے اس طرح ہیں تار نفس
قفل زنداں ہے گوش بر آواز
تیرے نالوں سے اب تو زنداں کی
ہے لرزنے لگی ہر اک دیوار
پگھلے جاتے ہیں سنگ و آہن بھی
تیری طرز فغاں میں ہیں وہ شرار

آتے ہیں بندگان عشق یہاں
ہے یہ وہ درگہہ عبادت عشق
اعتکاف ان کا گوشۂ زنداں
اور سلاسل پیئے ریاضت عشق
ورنہ زنداں کے یہ در و دیوار
اور یہ آزادگان عشق کہاں
ہیچ جن کی نظر میں ہے یہ حصار
یہ سلاخیں، یہ قفل، یہ زنداں

ANDREW MARVELL

(1620 - 1678)

اینڈریو ماروِیل

اینڈ ریو ماروِیل اپنے دور کے شعراء میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ اس کا شمار بھی مٹیا فزیکل شعراء میں ہوتا ہے۔ مذہبی لگاؤ کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کے جذبہ سے بھی سرشار تھا۔ کراموِیل کا مداح ہے مگر بادشاہ کے خلاف بھی کچھ نہیں کہتا۔

ذیل میں اس کی مشہور نظم (The Garden) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو اس نے انگلستان کی طویل خانہ جنگی ۵۳-۱۶۴۲ء کے خاتمہ پر لکھی تھی۔

متحارب فوجوں میں صلح ہو چکی ہے۔ اظہار یکجہتی کے لئے سیریمونیل پریڈ ہو رہی ہے۔ مختلف رجمنٹ اپنے اپنے رنگین پرچم اٹھائے مختلف رنگ کی وردیوں میں ملبوس، سروں پر مختلف رنگوں کی ٹوپیاں پہنے، مختلف رنگ کی کلغیاں لگائے ہوئے ہیں۔ شاعر کو یہ منظر پھولوں بھرا ایک باغ دکھائی دے رہا ہے۔ جس کی تصویر کشی اس نے پہلے اسٹینزے میں یوں کی ہے۔

ایک باغ

(انگلستان کی خانہ جنگی (۶۰-۱۶۴۲ء) کے خاتمہ پر)

پھولوں کی ہے پریڈ' گذرتا ہے یہ گماں
پرچم وہ رنگا رنگ' جدا ان کی وردیاں
دستے' رسالے' گویا صف آرا ہیں پھولوں کے
یوں آملے ہیں قافلے ان بھٹکے بھولوں کے

حب وطن دلوں میں ہے ان کے بسی ہوئی
گویا مگس ہے پھول کے اندر چھپی ہوئی
ہے چھیڑنے کی دیر تڑپ کر نکلتی ہے
پھر شہد کے عوض وہ ہلاہل اگلتی ہے

جنت نظیر میرے وطن' اے عروس بحر
کس کی نظر لگی تجھے' کس نے کیا یہ سحر
باد خزاں نے لوٹ لی دم میں تری بہار
رنگیں ہے آب تیغ سے ہر قریہ و دیار

مہندی کے بدلے ہاتھ رنگے تو نے خون سے
جوش جنوں میں بڑھ گئی حد جنون سے
ہو جس کی سرحدوں کا امیں بحر بے کنار
اس سر زمیں کا امن ہو یوں نذر انتشار

اپنوں کے خوں سے کیسی یہ تو نے بجھائی پیاس
دل رو رہا ہے جس پہ ہر اک روح ہے اداس
نادان تو نے چکھ لیا ممنوعہ وہ شجر
جنت کے بدلے کیوں نہ جہنم ہو تیرا گھر

آتی ہیں یاد تیری بہاریں، مرے وطن
تو غیرت بہشت تھا، تو رشک صد عدن
تھا بستیوں میں نور، فضاؤں میں تھا سرور
جاہ و جلال تھا ترا مشہور نزد و دور

صد شکر، خانہ جنگی ہوئی ختم، مرحبا!
پھر لوٹ آئی امن و اماں کی وہی فضا
افواج سرحدوں کی حفاظت میں صبح و شام
رکھیں گی اب نہ ملکی سیاست سے کوئی کام

پھول اپنی چھاؤنی میں کھلائیں گے رنگ رنگ
خود و زرہ پہ اور کہیں زیب سلاح جنگ
باغ وطن میں پھول کھلیں گے سدا بہار
پہنیں گے لوگ امن و خوشی کے پرو کے ہار

ABRAHAM COWLEY (1618-1667)

ابراہام کاؤلے

ابراہام کاؤلے اپنے دور کا بے حد پسندیدہ شاعر رہا ہے۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اپنا پہلا مجموعہ کلام چودہ سال کی عمر میں شائع کیا۔ بعد کو وہ بھی میٹا فزیکل شعراء کی صف میں شامل ہوگیا۔ اس کی عشقیہ اور خمریہ نظمیں بے حد مقبول خاص و عام ہوئیں۔ اس کے ابتدائی دور میں تشبیہات، استعارات اور مبالغہ آرائی وغیرہ کو پسند کیا جاتا تھا، کاؤلے نے بھی ان میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ لیکن بعد کی دہائیوں میں ان تکلفات کی جگہ ظرافت اور بذلہ سنجی نے لے لی۔ کاؤلے نے بھی اس نئے افق کی سمت اپنی شاعری کا رخ موڑنے کی کوشش کی لیکن زیادہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کا سرمایہ اس کے ابتدائی دور کی شاعری ہے اور وہی اس کی دائمی شہرت کے لئے کافی ہے۔

ذیل میں کاؤلے کی مشہور نظم (A Supplication) کا آزاد ترجمہ "ساز سخن" کے عنوان سے اوریجنل نظم کے فارم میں مغربی موسیقی کے مطابق چھوٹے بڑے مصرعوں میں پیش خدمت ہے۔

سازِ سخن

جاگ اے سازِ سخن! جاگ مرے سازِ سخن!
ڈال کر دل کی صداؤں پہ سُروں کے پردے
گیت اس طرح مرے سوز و اثر سے بھر دے
در خورِ بارگہِ حسن ہو یہ ہدیۂ فن
وہ نسب میں اعلیٰ
اور میں ہوں ادنیٰ
کیا نہیں ہوتا ہم آہنگ سُر اونچا نیچا؟

جاگ اٹھا سازِ سخن اپنا جگانے جادو
دلِ صد چاک میں سوئے ہوئے نغمے جاگے
کانپتی انگلیاں بڑھنے لگیں آگے آگے
ہاں، مرے ساز، بیاں کر دے مرے سوز کو تو
کر دے سب گوش گذار
آرزوئے دلِ زار
پردۂ ساز میں ہر سوز کا کردے اظہار

بے اثر ساز، تری کاوشیں بے سود تمام
تو مداوا تو ہے غم کا، نہیں دے سکتا ہے غم
اور وہ ہیں زخم تو دیتے، نہیں رکھتے مرہم
سب کے تو درد کا درماں ہے مگر خود ناکام
آہ اے ساز سخن
میرے انداز سخن
کیا اسی سوز پہ اپنے تھا تجھے ناز سخن؟

ہو جا خاموش، مرے ساز سخن، پھر سو جا!
ساز دل سے تو ہم آواز نہیں ہوسکتا
ان کے دل پر اثر انداز نہیں ہوسکتا
ہو جا خاموش، ہمیشہ کے لئے چپ ہوجا!
نہ دے یہ زحمت گوش
کر دے تاروں کو خموش
دفن اس ساز کو کردے، کہیں ہوجا رو پوش

HENRY VAUGHAN

(1622-1695)

ہنری واگھان

ہنری واگھان ویلز Wales کا رہنے والا تھا۔ اس کی مادری زبان ویلش (Welsh) تھی جس کی جھلکیاں اس کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ اس مجموعہ تراجم میں صرف اسی ایک ویلش شاعر کی ایک نظم (The Retreat) کو "واپسی" کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

واگھان نے بہت تھوڑا کلام یادگار چھوڑا ہے۔ اس کے باوصف انگریزی ما بعدالطبیعیا تی شاعری (Metaphysical Poetry) میں وہ اپنا مقام رکھتا ہے۔ اس کا کلام عارفانہ ہے جسے انگریزی میں مسٹی سزم (Mysticism) کہتے ہیں ہمارے بعض ناقدین کے نزدیک یہ لفظ مشرقی اصطلاح "تصوف" کے ہم معنی ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں میں تھوڑی سی قدر مشترک ضرور ہے ورنہ ان مشرقی اور مغربی اصطلاحوں میں مشرق و مغرب کا بعد ہے۔

واگھان کے نزدیک روح ایک غیر فانی نوری جوہر ہے۔ ؎

ازل جس کے پیچھے' ابد سامنے
نہ حد جس کے پیچھے' نہ حد سامنے

اس کے ازلی اور ابدی دونوں سرے تابندہ ہیں۔ وہ نور سے آتی ہے اور نور کو لوٹ جاتی ہے۔ دنیا میں آکر اس کا نوری جوہر دھندلانے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ قطعی ماند پڑ جاتا ہے۔ ابتدائے طفلی میں عہد نوری کی جھلکیاں اس کے معصوم ذہن میں کبھی کبھی ابھرا کرتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ غائب ہوجاتی ہیں' یہاں تک کہ انسان انہیں قطعی بھول جاتا ہے۔ یہی خیال اس نظم میں پیش کیا گیا ہے اور جو اخلاقی درس جس شاعرانہ انداز میں دیا گیا ہے' لائق توجہ ہے۔

ہنری واگھان
(۱۶۲۱-۹۵)
ترجمہ
واپسی

مری طفلی، مری گمگشتہ جنت
کہ تھی خوشیوں ہی خوشیوں سے عبارت
تھا تازہ تازہ روح و تن کا رشتہ
میں انسان سے زیادہ تھا فرشتہ
شعور و فہم ناپختہ تھا میرا
مری یادوں پہ چھایا تھا اندھیرا
اندھیروں کا مگر پردا اٹھا کر
گزر جاتا تھا کوئی مسکرا کر
کبھی اس کی جھلک تھی بادلوں میں
کبھی پھولوں کے رنگیں آنچلوں میں

مرا دل خود بخود اس سمت کھنچتا
میں نا سمجھی میں بھی کچھ کچھ سمجھتا
نہاں مجھ میں مرے نوری عناصر
دکھاتے طرفہ تر مجھ کو مناظر
مگر جوں جوں مجھے آتا گیا ہوش
لگی وہ شمع بھی ہونے کو خاموش
زباں کو جھوٹ کی دے کر اجازت
دی ہر جرم سیہ کو میں نے دعوت
پھر ان کی ظلمتوں سے ہو کے مانوس
بجھا دی میں نے شمع زیر فانوس
لگی جمنے پھر اس پر گرد عصیاں
رمق بھر کو نہ چھوڑا نور ایماں
اندھیروں میں بھٹکتا بے سہارا
رہا اک عمر پھرتا مارا مارا
مگر گل ہو کے بھی وہ شمع اکثر
مجھے رستہ دکھا دیتی بھڑک کر
پر اس پر بھی نہ اس کی قدر جانی
ہوا آخر کو اونچا سر سے پانی

جو میں اب دیکھتا ہوں مڑ کے پیچھے
نظر آتے ہیں وہ پر پیچ رستے

بنائے تھے بزعم خود جو میں نے
اوامر سے الگ، ہٹ کر ڈگر سے
دکھائی دے رہا ہے صاف وہ موڑ
جہاں سے راستہ سیدھا دیا چھوڑ

وہیں پھر کیوں نہ ہو جاؤں میں واپس
جہاں پتھر بھی بن جاتا ہے پارس
اگرچہ ہوں نکل آیا بہت دور
ہوا ہر چند ہوں تھک ہار کر چور
مگر واپس وہیں مجھ کو ہے جانا
وہیں پھر اپنی بگڑی ہے بنانا
جہاں وہ نور اب بھی جلوہ گر ہے
جہاں کی خاک میری منتظر ہے

JOHN DRYDEN

(1631 - 1700)

جان ڈرائیڈن

سترھویں صدی میں ملٹن کے بعد دوسرا اہم برطانوی شاعر جان ڈرائیڈن ہے۔ مگر دونوں کے درمیان ایک نسل کا فاصلہ ہے۔ ڈرائیڈن نے اپنی قادر الکلامی سے انگریزی شاعری کو مزید جلا بخشی۔ اطالوی اور فرانسیسی تقلید کی بجائے برطانوی مزاج کے موافق اصول وضع کئے اور انگریزی ادب میں "نوکلاسیکی" مدرسہ فکر کی بنیاد رکھی۔ جس کے سبب نہ صرف اپنے دور میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ بعد کے شعراء کے لئے ایک رہنما اسلوب شاعری چھوڑ گیا۔ اس لئے اس کو بھی اسپنسر کی طرح (Poets'Poet) "شاعروں کا شاعر" مانا جاتا ہے جس کی تقلید نہ صرف اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک کے شعراء کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈرائیڈن نہ صرف شاعر بلکہ ڈرامہ نویس اور نثر نگار بھی تھا وہ کیمرج کا فارغ التحصیل، یونانی اور لاطینی شعر و ادب پر گہری نظر رکھتا تھا اس نے ورجل (Virgil) کو بڑی خوبصورتی سے انگریزی میں منتقل کیا۔ اسٹیج کے لئے بہت سے ڈرامے لکھے اور نظم و نثر کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑ گیا۔

ڈرائیڈن کی مشہور نظم (Song for St. Cecilia's Day) کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرائیڈن نے اس نظم میں تخلیق کائنات کا کرشمہ یونانی دیومالا کے پس منظر میں پیش کیا ہے کہ کس طرح موسیقی کے اثر سے آسمان و زمین، سیار و ثوابت وجود میں آئے اور اس دنیائے آب و گل میں بتدریج زندگی کی ابتداء ہوئی اور پھر یہی سریلے سُر ایک دن اس سارے نظام کو درہم برہم کریں گے۔ اگر اس مضمون کو خالصتہ" مغربی انداز میں ادا کیا جاتا تو ہماری روایات سے بہت دور ہوجاتا اس لئے میں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے اور یونانی دیو مالا کی بجائے مشرقی روایات کے موافق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ترجمہ

سازِ مقدس

ارغنوں جب وہ سرِ عرش ہوا زمزمہ ساز
رقص کرنے لگے افلاک پہ ماہ و انجم
اوج ذروں کو ملا، تھی وہ صدا ذرہ نواز
چاند تارے ہوئے تاروں میں سب اس ساز کے گم
تیز سے تیز تر اس طرح ہوا سازِ ازل
زرفشاں پھولوں سے تھا مثلِ چمن صحنِ فلک
کہیں پروین و ثریا تو کہیں حور و ملک
خطِ گلزار میں رنگین و مرصع وہ غزل
تھا یہ اس ساز کا اعجاز سرِ عرش بریں
بچھ گئے خاک کے ذرے صفتِ فرشِ زمیں
سرد و گرم اور ہوئے خشک و تر اس طرح قریب
زندگی اپنے عناصر لگی دینے ترتیب
اور پھر روئے زمیں پر ہوا سبزہ آغاز
گل کھلانے جو چلی بادِ بہاری ہر سو

رنگ و بو نے بھی بصد ناز سنوارے گیسو
بُلبلیں صحنِ گلستان میں ہوئیں نغمہ طراز
ساز بجتا رہا، بجتا رہا اور آخری تان
جس پہ ٹوٹی تھا وہ مسجودِ ملائک انسان

سُر مقدس تھے وہ اور ان کی مقدس تھی وہ دھن
نغمہ ساز مقدس فقط اک حرف تھا "کن!"
بسکہ اعجاز سے اس ساز کے پایا جو وجود
کائنات عرش سے تا فرش ہوئی سر بہ سجود
سارے سیار و ثوابت وہ مہ و مہر و نجوم
محو تسبیح تھے یا خالق حی و قیوم
جھک گئے سب کے سب اس خالق اکبر کی طرف
جس نے پیدا کیا، بخشا یہ انہیں عز و شرف

اور اس سازِ مقدس سے ہم اب تک سرشار
تڑپ اٹھتے ہیں جگاتا ہے جو جادو کوئی ساز
جیسے پھر سے ہو بلاتا ہمیں کوئی اک بار
جیسے پہچانی ہوئی سی وہ کسی کی آواز
ہے یہی وجہ کہ ہے وجہ کشش موسیقی
روح بھولی نہیں اب تک ہے وہ سازِ ازلی
سُر جو سچے ہوں تو رکھتے ہیں وہ تاثیر غضب
غم و اندوہ میں تسکین کا ساماں کر دیں

اور جو چاہیں تو رجز خواں سر میداں کر دیں
کبھی پیغام طرب اور کبھی ترغیب تعب

اک کرشمہ تھا سُروں کا وہ سر عرش بریں
کہ ہوئی جن کے سبب خلقت افلاک و زمیں
یہی سُرُ صور سرافیل کا بن کر پیغام
جب وہ گونجیں گے تو ہوجائے گا برہم یہ نظام

اٹھارھویں صدی کے برطانوی شعراء

اٹھارھویں صدی براعظم یورپ میں ایک انقلابی دور ہے' جس کے اثرات وہاں کے سماجی اور معاشی حالات پر آہستہ آہستہ مرتب ہو رہے ہیں۔ بر و بحر تقریبا مسخر ہو چکے ہیں۔ صنعتی انقلاب دستک دے چکا ہے۔ برآمدات کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی نظام کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ ان حالات میں انداز فکر بھی بدل رہے ہیں۔ چنانچہ اس صدی کے شعراء میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آغاز صدی میں پوپ چھایا ہوا ہے۔ سوئفٹ نظم و نثر دونوں کا مرد میدان ہے' مگر نثر میں اپنی تصنیف (Gulliver's Travel) "گلورز ٹریول" کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ درمیانی صدی میں گرے سب سے نمایاں ہے۔ اس کے دوسرے معاصرین میں ڈاکٹر جانسن اور گولڈ اسمتھ ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے انگریزی زبان کی پہلی ڈکشنری ترتیب دی۔ اس حوالے سے اس کا نام بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آخر صدی میں برنس' کوپر' اور بلیک کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

آیئے اس صدی کے ان تمام مذکورہ بالا شعراء کا مختصر تعارف اور ان کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

ALEXANDER POPE
(1688 - 1744)

الیگزانڈر پوپ

الیگزانڈر پوپ کو انگریزی شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس نے ڈرائیڈن کو اپنا آئیڈیل بنایا اور اسی کے مشن کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ قریب قریب تکمیل کو پہنچا دیا۔ اس کے کلام میں بلا کا جادو ہے۔ اس نے بچپن ہی سے شعر موزوں کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اس کا پہلا مجموعہ کلام ۱۷۰۹ء میں شائع ہوا جبکہ اس کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ اس مجموعہ میں اس کا وہ کلام بھی شامل تھا جو اس نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں منظوم کیا تھا۔ تمام ناقدین پوپ کی اس خداداد صلاحیت کے معترف ہیں۔ پوپ نے جو کچھ لکھا، بہت خوب لکھا اور عروض کی جتنی پابندی پوپ کے یہاں نظر آتی ہے کسی اور برطانوی شاعر کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی۔

ان صفحات میں پوپ کی تین نظموں کا منظوم اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلی نظم (Solitude) کو "سکون قلب" کے عنوان سے اردو میں اسی رائم اسکیم میں منتقل کیا ہے۔ یہ نظم پوپ کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے۔ دوسرا ترجمہ اس کی ایک طویل نظم (An Essay on Criticim) کا ایک مختصر حصہ ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آج لفظ Essay کا اطلاق صرف ایک صنف نثر پر ہوتا ہے جبکہ پوپ کے عہد میں Essay نظم میں بھی لکھا جاتا تھا۔

سکون قلب

ہے بڑا خوش نصیب جس کے پاس
چند ایکڑ ہو جد کی آراضی
اور وہ خود اعتماد فرض شناس
اپنے رب کی رضا پہ ہو راضی

کھیت سے اپنے کھائے وہ خوش بخت
روٹی، پھل پھول، ہر طرح کے ساگ
دھوپ میں ٹھنڈی چھاؤں اس کے درخت
اور جاڑوں میں تاپنے کو آگ

اپنی بھیڑوں کی اون کا ہو لباس
گائے کا اپنی دودھ، مکھن، گھی
اپنے گھر کے لئے ہوں اس کے پاس
اس کی سادہ ضروریات سبھی

وسوسوں سے تمام ہو آزاد
فکر فردا کوئی نہ ہو غم دوش
اور عبادت سے اپنی جو دلشاد
بسر کرتا ہو خرم و خاموش

سکھ سے سوتا ہو پاؤں پھیلا کر
وہ سرور مٹے قناعت ہو
پاک بغض و عناد سے یکسر
جس کا دل سر بسر محبت ہو

جس کو جانے کوئی نہ پہنچانے
دوں میں اس طرح اپنی عمر گزار
رونے والا نہ کوئی سرہانے
نہ بتانے کو نام سنگ مزار

کم علمی

(آزاد ترجمہ)

پُر خطر ہے علم تھوڑا، یہ مئے وجد آفریں
یا تو پیجئے سیر ہو کر، یا اسے چکھیئے نہیں
صرف اک دو گھونٹ سے تو ہے بہک جاتا بشر
خوب سی پی کر وہ بن جاتا ہے لیکن خوب تر
ہم کو نومشقی میں کچھ مصرعے جو ہوتے ہیں عطا
ہم سمجھتے ہیں کہ فن کی رفعتوں کو چھو لیا
جبکہ سطحی سوچ اور محدود ہوتی ہے نظر
اور جن کا دائرہ ہوتا ہے بے حد مختصر
گو ابھی تو صرف اس وادی میں رکھا ہے قدم
پر ہے خوش فہمی ہیں اس کے جانتے سب پیچ و خم
جب نظر آتا ہے کوئی دور سے کوہ گراں
بیشتر اس پر ہمالہ کا گذرتا ہے گماں

اور سر کرنے کو اس کوہ گراں کے واسطے
منتخب کرتے ہیں سعی و سہو کے ہم راستے
چڑھ کے اس کی گھاٹیوں میں گر ٹھہرتے ہیں کہیں
جانتے ہیں گویا جا پہنچے سر عرش بریں

لیکن علم و آگہی کی پھوٹتی ہے جب کرن
رفتہ رفتہ کھلنے لگتے ہیں رموز فکر و فن
اور علم و آگہی کرتے ہیں جب روشن چراغ
روشنی سے ان کی ہوجاتا ہے روشن تر دماغ
اب حقیقت بیں نگاہیں دیکھتی ہیں دور تک
ہیں سر بام فلک آتے نظر حور و ملک
پھر بھی، فن کی رفعتوں کی سمت ہم بڑھتے ہیں جب
سلسلہ ان رفعتوں کا ہے نظر آتا عجب
رفعتوں پر رفعتیں ہیں، ڈالیں کس کس پر کمند
ہر ہمالہ کے پرے اِک ہمالہ سر بلند

پوپ کی ایک اور شہرہ آفاق نظم (Essay on Man) کے چند اشعار کا آزاد ترجمہ "مطالعہ انسان" کے عنوان سے ہدیہ ناظرین ہے۔ شاعر نے نہایت عالمانہ انداز اور جامع الفاظ میں فطرت انسانی کا تجزیہ تمامتر شعری لطافتوں اور اوزان و قوافی کی پابندیوں کے ساتھ پیش کیا ہے جو نفس مضمون کے اعتبار سے بھی انتہائی فکر انگیز ہے۔ میں نے ان اشعار کو اوریجنل کے انداز میں اردو میں منتقل کرنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

(آزاد ترجمہ)

مطالعہ انسان

جو خود کو جانا، تو سمجھو لیا بہت کچھ جان
ہے اہم سب سے جہاں میں مطالعہ انسان
عجیب شے ہے یہ انساں، مرکب اضداد
ہے خیر و شر سے عبارت سرشت آدم زاد
خمیر میں ہیں جو اس کے عناصر ضدین
معلق عرصہ وہم و یقیں کے ہے مابین
صحیح ہے اور غلط کیا؟ یہ نوع دانشور
ہنیں مگر کسی نکتے پہ متفق یکسر
ادھیڑ بن میں اسی کے وہ عاقل و دانا
نتیجہ اخذ کرے کوئی "ہاں" تو کوئی "نا"

خرد کی ضو سے ہے ہر گاہ خیرہ اس کی نگاہ
سمجھتا خود کو رہ حق پہ ہے بھٹک کر راہ
ہیں ذہن پر جو مسلط شکوک اور شبہات
انا کے خول میں رہتی ہے بند اس کی ذات
توہمات سے اس کی سجی ہے بزم خیال
فقط قیاس پہ مبنی ہے اس کا استدلال
کبھی ہے اپنی توانائیوں پہ اس کو ناز
ہے سجدہ ریز کبھی عجز سے جبین نیاز
کبھی یہ زعم کہ فوق البشر ہے اس کا وجود
کبھی گماں ہے کہ حیواں سے بدتر و بے سود
ہزار فہم و فراست پہ بھی وہ بیچارہ
کبھی نہ جہل مرکب سے پائے چھٹکارا
ہوا ہے مرنے کو پیدا ، یہ بھول جاتا ہے
کہ چند روز کا دنیا سے اس کا ناتا ہے

JONATHAN SWIFT
(1667-1745)

جونیتھن سوئفٹ

وہ ڈبلن (آئرلینڈ) کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کی ولادت سے پہلے اس کا باپ اور دادا ایک حادثہ میں جاں بحق ہو چکے تھے۔ عزیز و اقارب نے اس کی پرورش پر مناسب توجہ نہ دی۔ اس کا بچپن بڑے نامساعد حالات میں گذرا جس کے گہرے نقوش اسکی شخصیت میں مرتب ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں اسے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیا گیا۔ ۱۶۸۶ء میں ڈبلن سے بی۔اے پاس کیا۔ ۱۶۸۹ء میں انگلینڈ چلا گیا جہاں سرولیم ٹیمپل کا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوگیا اور اپنے مخدوم کی جاگیر مور پارک میں خاندان کے ایک فرد کی طرح رہنے لگا۔ اس کے مخدوم کا اس عہد کے دانشوروں میں شمار تھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ تھا جس سے نوجوان سوئفٹ کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اور وہیں سے اس کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ۱۶۹۲ء میں آکسفورڈ سے ایم۔اے پاس کیا اور مذہبی علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۷۰۱ء میں وہ واپس آئرلینڈ چلا آیا جہاں کئی سال اعلیٰ کلیسیائی مناصب پر فائز رہا۔

وہ اپنے عہد کا بہترین طنز نگار تھا۔ اس کی نظم و نثر دونوں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ۱۷۰۴ء میں اس کا ناول (A Tale of a Tub) شائع ہوا۔ جس سے اسے بڑی شہرت ملی۔ ۱۷۲۶ء میں وہ دوبارہ انگلینڈ آیا اور اپنے معاصرین الیگزانڈر پوپ' ڈینیل ڈیفو' جورف ایڈیسن سے ملا اور اپنی غیر فانی تخلیق "گلیورز ٹریولز" (Gulliver's Travels) شائع کی۔ بقول مصنف اس نے اپنی دانست میں اس تخلیق میں اپنے عہد کی بعض اہم شخصیتوں کا مذاق اڑایا ہے۔ مگر جس اچھوتے انداز میں اس نے اس کہانی کو پیش کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس نے اس عہد کی جن شخصیتوں کو ہدف تنقید بنایا تھا' آج کا عام قاری انہیں جانے بغیر مصنف کی جدت طرازی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ آخر عمر میں اس کی صحت جواب دے گئی تھی اور طویل علالت کے بعد ۱۷۴۵ء میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

۱۷۳۹ء میں اس کی نظم (On The Death of Dr. Swift) شائع ہوئی جو بے حد دلچسپ اور طنز و مزاح سے بھری ہوئی ہے۔ اس طویل نظم کا تھوڑا سا حصہ اردو میں ترجمہ کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ مصنف کی جدت طبع اور اس کے مخصوص طنز و مزاح کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

جونتھن سوئفٹ

(۱۶۶۷-۱۷۴۵)

ترجمہ

اپنا مرثیہ

نہیں دور وہ دن کہ دستِ اجل
بڑھے میری جانب کہ چل' ساتھ چل
تھا گذرا ہی دل میں ابھی یہ خیال
ہوا ہول سے میرا جینا محال
کہا فکر نے فکر کی گر ہے بات
میں حاضر ہوں' لیجئے قلم اور دوات
کریں مرثیہ آپ اپنا رقم
خود اپنے پہ فرمائیں مشقِ ستم
ہو اک منفرد مرثیہ خود نوشت
ذرا جیتے جی کیجئے سیرِ بہشت
مجھے بھی یہ تجویز آئی پسند
کی تائید خامے نے ہو کر بلند
پس اے خامہ من! دکھا اپنا زور
بہت تیری جدت کا سنتے ہیں شور

زبانوں پہ ہے اہل لندن کی آئے
سدھارا وہ مرد فلاطوں مزاج
جونتھن سوئفٹ، ایک اہل قلم
جو رکھتا نہ تھا پاس طبل و علم
مگر ناگہاں مرگ پر اس کی لوگ
جمع ہو رہے ہیں منانے کو سوگ
ہیں احباب بھی اور اغیار بھی
ہیں موجود چند اہل دربار بھی
ہے لب پر کسی کے، عجب مرد تھا
اس امروز و فردا میں اک فرد تھا
بھلا چنگا کل تک تھا دیکھا اسے
نہ جانے اچانک ہوا کیا اسے

تھا ذاتی معالج کا اس کے بیان
مرے مشوروں پر نہ دھرتا تھا کان
کیا جب گیا جسم کو اس کے چاک
تھے اندر کے اعضا سبھی ٹھیک ٹھاک
جو صحت کا رکھتا مناسب خیال
تو جیتا ابھی اور دس بیس سال

کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ حق پرست
زبردست ہو کر بھی تھا زیر دست

تھا زور اس کی تحریر و گفتار میں
رسائی بھی تھی راج دربار میں

کوئی پوچھتا تھا کہ اے ہم نشیں
ہے وارث بھی اس کا کوئی یا نہیں؟
یہ سب ملک و املاک یہ جائیداد
ہوئی نام کس کے، تمہیں کچھ ہے یاد؟
وہ بولا کہ اس کی وصیت یہ تھی
نہ ترکہ مرا پائے ہرگز کوئی
بنے اس سے اک مرکز احمقاں
پھلے پھولے فن حماقت جہاں

کلب میں مرے جب یہ پہنچی خبر
مرے سوگ میں جھک گئے سب کے سر
کسی نے لیا تاش میں منھ چھپا
کوئی پتے ہاتھوں میں گننے لگا
بھری ایک خاتون نے آہ سرد
لگیں دوسری پونچھنے رخ سے گرد
کوئی "انا للہ!" کہہ کر تھا چپ
کہا اک نے دھیرے سے "کیا ہے ترپ؟"
غرض ہر جگہ تعزیت ہے جدا
یہی رسم دنیا ہے مرد خدا

THOMAS GRAY

ٹامس گرے

(۱۷۱۶-۱۷۷۱)

گولڈن ٹریژری کے مولف کے نزدیک اٹھارہویں صدی کا سب سے عظیم برطانوی شاعر ٹامس گرے ہے۔ علم و فضل کے اعتبار سے اسے ملٹن (Milton) کے بعد درجہ دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یونانی ادب پر وہ ملٹن سے بھی زیادہ گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ جس عالمانہ شان اور فلسفیانہ استدلال سے اپنا موقف شعر کی زبان میں ادا کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے اس کی مشہور نظم (Elegy Written in a Country Churchyard) پر جنرل وولف فاتح کینیڈا نے اسے ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے کہ ”اے کاش میری شہرت فاتح کینیڈا ہونے کی بجائے (Elegy) جیسی کسی نظم کے باعث ہوتی۔!“

ذاتی طور پر مجھے بھی گرے کی یہ نظم بہت پسند تھی مگر اس کا نہایت خوبصورت اردو ترجمہ نظم طباطبائی مرحوم پہلی ہی فرما چکے ہیں۔ اس لئے میں

نے گرے کی ایک دوسری نظم (Hymn to Adversity) کا ترجمہ اوریجنل رائم اسکیم میں کیا ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ (Adversity) کا جامع اور پر معنی مترادف اردو میں میں نہیں تلاش کر سکا۔ میں نے اس مفہوم کو "گردش دوراں" سے ادا کیا ہے۔ گرے کی نظم کا ہر اسٹنزا آٹھ لائنز کا ہے جس میں آٹھویں لائن زیادہ لمبی ہے۔ جسے انگریزی عروض میں Alexendrine کہا جاتا ہے۔ اردو میں الگزنڈرائن کی کمی میں نے مستزاد سے پوری کی ہے۔

ٹامس گرے

ترجمہ

گردش دوراں

گردش دوراں' ستم ایجاد اے دخت فلک
ثبت پیشانی پہ تیری محضر ہفت آسماں
اے کہ تیری ہر ادا ہے طرفہ زخموں پر نمک
آزمائش نو بہ نو' تازہ بہ تازہ امتحاں
ہوش میں مدہوش آجاتے ہیں تیرے روبرو
ٹیڑھے ٹیڑھوں کو بھی سیدھا کر کے رکھ دیتی ہے تو
کبر سلطانی کے کس بل سارے دیتی ہے نکال
تیرے آگے چوکڑی سب بھول جاتے ہیں غزال
پھینکتی ہے تو وہ جال

سخت گیری تیری فطرت، سخت تر تیرا مزاج
تو کسی کے ساتھ اٹھا رکھتی نہیں کوئی کسر
رو رعایت کا نہیں تیرے یہاں ہرگز رواج
گریہ و زاری کا کچھ ہوتا نہیں تجھ پر اثر
حاکم و محکوم میں کرتی نہیں مطلق تمیز
بادشہ تیرے گدا، شہزادیاں تیری کنیز
دم میں کر دیتی قبائے قیصری ہے چاک چاک
پیس کر کوہ گراں کو بھی تو کر دیتی ہے خاک
بن کے قہر ہولناک

جبکہ خلاق ازل نے خلق نیکی کو کیا
وہ حسین تخلیق، فنکار ازل کا شاہکار
تھی ابھی منظور لیکن بخشنی اس کو جلا
تربیت اس کی ہوئی تیرے سپرد، اے طرحدار
سخت گیری نے تری بخشا اسے صبر جمیل
امتحان سخت سے اس کو دیا درس خلیل
درد دے کر تو نے اس کو کر دیا درد آشنا
دوسروں کے رنج میں رنجور اس کو کر دیا
مرحبا، صد مرحبا!

خود پسندی، خود نمائی، خود سرائی، خود سری
خاک میں ان کا ملا دیتی ہے تو سارا غرور
تیرے آگے ان کی کچھ چلتی نہیں بازیگری
منھ لئے اپنا سا تجھ سے بھاگتی ہیں دور دور
جن کے جاتے ہی جگہ پاتے ہیں صبر و شکر و حلم
باندھے دستار فضیلت حاضری دیتا ہے علم
تیرے در پر ہے کرم تیرے کرم کا خواستگار
اور تیرے رحم کا خود رحم ہے امیدوار
اے فریب روزگار!

اے سراپا آزمائش! مشفقانہ رکھ نظر
آزما، لیکن بقدر درس تسلیم و رضا
دور عصیاں سے رہوں، لے امتحاں بس اس قدر
کر مجھے تلقین وہ پاکیزہ غم کا فلسفہ
سوز غم سے جو غم و اندوہ کا رخ موڑ دے
توڑنے کے بدلے جو ٹوٹے دلوں کو جوڑ دے
منصفانہ کر سکوں اپنے عمل کا احتساب
ہر جفا و جور کا لطف و کرم سے دوں جواب
دے وہ ہمت اور وہ تاب

DR. SAMUEL JOHNSON
(1709-84)

ڈاکٹر سموئیل جانسن

ڈاکٹر سیموئیل جانسن انگریزی ادب کا ایک محترم نام ہے۔ وہ ایک شاعر مفکر، ادیب، نقاد اور اپنے وقت کا بہت بڑا زبان داں تھا جس نے انگریزی زبان کی پہلی ڈکشنری ترتیب دی۔

وہ اسٹیفورڈ شائر میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں مکمل کر کے اس نے آکسفورڈ کا رخ کیا۔ جہاں سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے قصبہ میں ایک اسکول جاری کیا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۷۳۸ء میں وہ لندن منتقل ہوگیا اور ایک رسالہ سے منسلک ہو کر ایک صحافی کے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس کے زور قلم اور حکومت وقت پر کڑی تنقید نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد اس نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، علمی و ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ اس کی نگارشات و تخلیقات بڑی دلچسپی سے بڑھی جانے لگیں۔ ۱۷۴۹ء میں اس کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۷۵۵ء میں اس

کی معرکہ آراء تصنیف انگریزی ڈکشنری منظر عام پر آئی جو اس کی نو برس کی محنت کا نتیجہ تھی اور جس نے اسے مالی منفعت کے علاوہ شہرت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اس کے قلم کی جولانیوں میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۷۶۵ء میں شیکسپیئر پر اس کی جامع کتاب شائع ہوئی جس پر ڈبلن یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔

ذیل میں ڈاکٹر جانسن کی مشہور نظم (The Scholar's Life) کا منظوم اردو ترجمہ ''دانشور'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے جو اس دور کے طالب علم کی سادہ زندگی اور حصول علم میں اس کی لگن کی آئینہ دار ہے اور عہد حاضر کے نوجوانوں کے لئے درس عبرت۔

ڈاکٹر سیموئیل جانسن

(۱۷۰۹-۱۷۸۴ء)

ترجمہ

دانشور

داخلہ کالج میں لے کر عالی ہمت نوجواں
علم کی عظمت پہ تج دیتا ہے تن آسانیاں

سخت کوشی، سعی پیہم کو بنا کر پھر شعار
خشک ان اوراق سے کرتا ہے رشتے استوار

شہرت و عظمت کے اپنی دیکھتا ہے خواب جب
ہے خوشی سے وہ اٹھا لیتا ہر اک رنج و تعب

گاؤن اور ہُڈ اس کی نظروں میں فضیلت کے نشاں
ہیں تبھی، رکھتا ہو علم و فضل بھی شایان شاں

نوجوان اے دوست، علم و فضل کی گر ہے لگن
سن لے میری بھی، گراں گزرے نہ گر میرا سخن

ہو مبارک، آپ کر لی راہ اپنی انتخاب
تو ہو علم و آگہی کی بارگہ میں باریاب

ہو مبارک حکمت و دانش کی تجھ کو روشنی
دل سے پہلے دور کر ہر عصبیت کی تیرگی

گر ہوں پہلے سے پراگندہ ترے ذہن و دماغ
صورت آئینہ کر لے صاف اپنے یہ ایاغ

علم کی ضو سے قریب آنے نہ دے اوہام کو
روشنی میں دیکھ ان خود ساختہ اصنام کو

رہنما ہر گام پر تیرے رہیں صدق و یقیں
جانچنے کو بات استدلال کی ہو خوردبیں

صبر و شکر و عجز کا دامن نہ چھوٹے ہاتھ سے
جیت لے دنیا کے دل اپنی اسی سوغات سے

دامن دانش پہ اک دھبہ نہیں دیتا ہے زیب
ہاں، ہوا و حرص کا مت کھائیو ہر گز فریب

فارغ التحصیل ہو کر بھی تکبر اور غرور
پاس آپائیں نہ تیرے، رہیو ان سے دور دور

ایک ہی کشتی میں تیرے ساتھ ہیں وہ بھی سوار
بخل و افلاس و رقابت، قدر داں، زندان و دار

کھول آنکھیں، رکھ نظر میں جزر و مد حالات کا
دے جواب اپنی فراست سے ہر ان کی بات کا

دیر سے دیتی ہیں قومیں اہل دانش کو مقام
ہیں تواریخ امم میں بیشتر ایسے ہی نام

OLIVER GOLD SMITH

(1730-74)

اولیور گولڈ اسمتھ

"جب قلم ہاتھ میں نہ ہو تو نہایت بیوقوف' اور جب قلم ہاتھ میں ہو تو انتہائی ذہین" یہ تھے ڈاکٹر جانسن کے تاثرات اولیور گولڈ اسمتھ کے متعلق۔ اور ان متضاد صفات کے باعث بے چارہ گولڈ اسمتھ ساری عمر پریشاں حال رہا۔

گولڈ اسمتھ کا وطن آئرلینڈ تھا۔ ڈبلن یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو کر اس نے ۱۷۵۲ء میں اڈنبرا کے مشہور میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۷۵۶ء میں فارغ التحصیل ہو کر جب لندن آیا تو جیب خالی ہو چکی تھی۔ اپنا کلینک کھولنے کی استطاعت نہ تھی۔ کسی طبی ادارہ سے منسلک نہ ہوسکا۔ تلاش معاش میں سرگرداں اس کی ملاقات ڈاکٹر جانسن سے ہوگئی جس نے اس بے روزگار نوجوان میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر اسے مقدر آزمائی کے لئے قلم کا سہارا لینے کا مشورہ اور حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر جانسن کی وساطت سے لندن کے ایک رسالہ میں اس کے مضامین چھپنے لگے۔ جنہیں بہت پسند کیا گیا اور اس طرح

اولیور گولڈ اسمتھ لندن کے علمی و ادبی افق پر نمودار ہوا۔ اس کی دو طویل نظمیں (The Traveller) 1764ء میں اور (The Deserted Village) 1770ء میں چھپ کر منظر عام پر آئیں اور مقبول ہوئیں۔ ایک ناول (The Vicar of Wakefield) 1766ء میں اور ایک ڈرامہ (She Stoops to Conquer) 1773ء میں شائع ہوئے۔

اٹھارھویں صدی کے شعراء کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہوئے ان صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ملک میں صنعتی انقلاب آچکا ہے۔ جابجا کارخانے قائم ہو رہے ہیں جہاں محنت کش کھیتوں میں کام کرنے سے زیادہ اجرت پا رہے ہیں اس کے نتیجہ میں لوگ دیہاتوں کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ زرعی زمینیں ویران اور گاؤں سنسان ہوتے جا رہے ہیں۔ گولڈ اسمتھ نے اس صورت حال کا نقشہ بڑے موثر الفاظ میں اس نظم (The Deserted Village) میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کے ایک حصے کے منظوم ترجمے میں اس اجڑے گاؤں کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

اولیور گولڈ اسمتھ

(۱۷۷۴-۱۷۳۰ء)

ترجمہ

"اجڑا ہوا گاؤں"

چھوٹی سی ایک پہاڑی پہ چھوٹا سا ۔ ایک گاؤں
ہر سمت سبزہ زار' درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں

ندی کنارے گاؤں کا پنگھٹ' وہ نرم ریت
دونوں طرف ہرے بھرے وہ لہلہاتے کھیت

مصروف اپنے کام میں وہ ہر طرف کسان
ریوڑ چراگھوں میں چراتے وہ گلہ بان

ہنس بول کر گزارتے دن کام کاج میں
محنت سرشت میں تو مشقت مزاج میں

اور شام کو وہ لوٹ کے آتے جب اپنے گھر
کہتے خوش آمدید انہیں، ان کے بام و در

خوشیوں کا ایک غلغلہ ہوتا وہاں بلند
بچے خوشی سے ناچتے بھرتے ہوئے زقند

وہ دودھ دوہتی گوالیں گا گا کے اپنے گیت
میداں میں کھیل کود، جیالوں کی ہار جیت

وہ گھنٹیوں کی دھن پہ چلے آتے گائے بیل
ندی پہ دھل گیا ہے سب ان کے بدن کا میل

وہ بھیڑ بکریوں کو لئے ساتھ گلہ باں
گھر کی طرف تھکے قدموں سے ہیں رواں

کتے بھی بھونکتے ہوئے ہمراہ آتے ہیں
مالک کے پاس جا کے دم اپنی ہلاتے ہیں

بطخیں بھی قیں قیں کرتی وہ ندی سے آتی ہیں
بچوں کو اپنے ساتھ لئے گھر کو جاتی ہیں

کل تھا یہی سماں، وہاں آباد گاؤں تھا
دیکھا جو آج، گاؤں نہ باقی گراؤں تھا

وہ گاؤں اب اجڑ گیا، ویران ہوگیا
بیزار اپنے کھیت سے دہقان ہوگیا

کھلیان کا نشاں، نہ وہاں لہلہاتے کھیت
جنگل اجاڑ، چار طرف اڑ رہی ہے ریت

رخصت ہوئے مکین، ہیں خالی پڑے مکان
اک بڑھیا رہ گئی ہے یہاں کوئی سخت جان

جنگل کے پھول پھل پہ کیا کرتی ہے گذار
اس اجڑے گاؤں کی ہے وہی ایک یادگار

WILLIAM COWPER

(1731 - 1800)

ولیم کوپر

اواخر اٹھارھویں صدی کے شعرائے انگلستان میں ولیم کوپر بھی قابل ذکر ہے۔ وہ ۱۷۳۱ء میں لندن کے ایک علم دوست مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے بیشتر افراد خاندان کلیسا سے وابستہ تھے۔ مگر اس نے فارغ التحصیل ہو کر وکالت کو اپنا پیشہ بنایا۔ نوعمری ہی سے اسے شعروشاعری سے دلچسپی تھی اور اکثر شعر بھی کہا کرتا تھا۔ ۱۷۶۳ء میں وہ ایک اعصابی مرض میں مبتلا ہوگیا۔ بارہ (۱۲) سال زیر علاج رہا۔ صحت یاب ہو کر اس نے اپنے آبائی گاؤں میں سکونت اختیار کرلی جہاں اس کے بعض عزیز و اقارب اس کی دیکھ بھال کیا کرتے۔ اپنے معالج کے مشورہ پر وہ باغبانی' پالتو جانوروں اور سیر و شکار وغیرہ سے دل بہلایا کرتا۔ ۱۷۷۵ء سے اس نے دوبارہ شاعری شروع کی لیکن صرف گاہے گاہے اور محض تفریح طبع کی خاطر' تاکہ اعصاب پر گراں نہ ہو۔ ۱۷۸۱ء میں اس کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

یہاں اس کی مشہور نظم (Solitude of Alexander Selkirk) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظم کا پس منظر نہایت دلچسپ ہے۔ الگزنڈر سیلکرک نامی ایک انگریز جہاز کی تباہی کا شکار ہو کر ایک سنسان اور غیر آباد جزیرے میں جا لگا، جہاں اس نے تن تنہا کئی سال گزارے اور اس اثنا میں اس نے وہ تمام سہولتیں اپنے لئے مہیا کیں جو ایک اکیلا آدمی اپنے لئے کر سکتا تھا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کسی جہاز کا اس طرف سے گزر ہوا جس کے ذریعہ غریب سیلکرک کو دوبارہ متمدن دنیا میں واپس آنا نصیب ہوا۔ اس کے حالات جب اخبارات میں شائع ہوئے تو لوگوں کو اس سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی اس زمانے کے مشہور ناول نگار ڈینیل ڈیفو (Daniel Defoe) نے اپنا غیر فانی کردار رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) تخلیق کیا اور کوپر نے یہ خوبصورت نظم لکھی۔

ترجمہ

تنہائی

میں یاں کا بادشاہ' یہ میری ہے سلطنت
پست و بلند چار طرف دیکھئے جدھر
دخل اس میں ہے کسی کا نہ کوئی مداخلت
بس میں ہی میں ہوں اور یہ سنساں دشت و در

اے گوشۂ سکوں کہ ہیں کرتے جسے تلاش
وہ اہل فکر و فہم' وہ ارباب نکتہ رس
تیرا سکوں انہی کو مبارک' مجھے تو کاش
ہو شور و غل نصیب کہ گیا ہوں جسے ترس

میں کارواں سے اپنے بچھڑ کر ہوں رہ گیا
تنہا سفر ہے' جانئے منزل ہے کتنی دور
شاید نہ سن سکوں گا اب ان کی کبھی صدا
راحت تھی جن سے روح کو اور قلب کو سرور

وحش و طیور دیکھتے حیرت سے ہیں مجھے
شاید مجھے سمجھتے ہیں اپنا سا جانور
یہ دیکھ کر مجھ سے نہیں دور بھاگتے
کیا کہئے مجھ پہ شاق گذرتا ہے کس قدر

سچ تو یہ ہے معاشرہ نعمت ہے اک عجب
جس کے بغیر آہ' جہنم ہے زندگی
فرداس معاشرے کا یہاں بھی ہوں کیامیں اب؟
کیا آئیں گے یہاں مجھے لینے کو وہ کبھی؟

ہوسکتا گر تو اڑ کے پہنچتا میں پھر وہاں
کرتا غموں کا اپنے مداوا پھر ایک بار
ہوتا جو ان کی بزم میں پھر ان کے درمیاں
کرتا ہزار شکر کے سجدے میں دلفگار

اے باد نامراد! گذر ہو ترا اگر
اس دور دیس میں کہ تھا اپنا کبھی وطن
کہیو کہ تیری یاد میں رہتا ہے نوحہ گر
اک خانماں خراب بصد حسرت و محن

ہاں' لائیو خبر کہ ہیں کس حال میں وہاں
میرے عزیز دوست' وہ اہل وطن تمام

ہوتا ہے میرا ذکر کبھی ان کے درمیاں؟
کیا اب بھی کوئی پیار سے لیتا ہے میرا نام؟

یہ فاصلے مگر نہیں ہوسکتے سدراہ
اڑ کر میں جا پہنچتا ہوں اک آن میں وہاں
طوفاں تو کیا' ہے پا نہیں سکتی مجھے نگاہ
اے طائر خیال کی پرواز' الاماں!

لیکن ہے ٹوٹ جاتا بہت جلد وہ طلسم
احساس جونہی یاد دلاتا ہے کہہ کے بس!
جاگ ان سہانے سپنوں سے' پابند جان و جسم
مایوسیاں ہیں اور ہے مقدر ترا قفس!

لو تھم گئیں وہ تیز ہوائیں بھی دن ڈھلے
پہنچا وہ آشیانہ مغرب میں آفتاب
لو اپنے اپنے ٹھور ٹھکانوں کو سب چلے
وحش و طیور بھی ہوئے رخصت بصد شتاب

اور میں بھی اپنی کٹیا کی جانب ہوں اب رواں
جینے کا ایک عزم لئے اور حوصلہ
سمجھوتہ مجھ کو کرنا ہے حالات سے یہاں
دل ہے قوی کہ میرا نگہبان ہے خدا

ROBERT BURNS

(1759 - 1796)

رابرٹ برنس

رابرٹ برنس اٹھارھویں صدی کا کئی لحاظ سے ایک منفرد اور قابل ذکر شاعر ہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ کے ایک غریب کسان کا بیٹا تھا' جس نے خود بھی ایک شکمی کاشتکار کی سادہ زندگی بسر کی۔ اگرچہ وہ اپنے زمانے کے اعتبار سے اتنا پڑھا لکھا تھا کہ اسے انگریزی شعرو ادب پر خاصا عبور تھا۔ لیکن اس نے عام ڈگر سے ہٹ کر انگریزی کی بجائے اسکاٹ لینڈ کے دیہاتیوں کی بولی کو (جسے انگریزی کی ایک ٹوٹی پھوٹی قسم کہہ لیجئے) اپنی شاعری کے لئے منتخب کیا۔ اس نے اسکاٹ لینڈ کی لوک دھنوں میں اسکاٹ لینڈ کی دیہاتی بولی میں بڑے خوبصورت گیت لکھے' جس کے باعث اسے اسکاٹ لینڈ کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔ اس نے ان بظاہر ہلکے پھلکے گیتوں میں گہرے مطالب ادا کئے۔ اس کے کلام میں سوز و سرور کی ایک عجب وجدانی کیفیت ہے۔

ذیل میں برنس کی مشہور نظم (A Farewell) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جسے میں نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ترجمہ

رخصت اے دوست

رخصت اے دوست، پہ اک جشن منالوں، تو چلوں
لو ذرا اور چراغوں کی بڑھا لوں، تو چلوں
بزم اک بار اسی طرح سجالوں، تو چلوں
میرے محبوب، گلے تجھ کو لگالوں، تو چلوں

شام غم کی وہ سیاہی، وہ گھٹائیں گھنگھور
اور وہ عفریت اندھیروں کے مچاتے ہوئے شور
اس شب تار میں اک شمع جلا لوں، تو چلوں
میرے محبوب، گلے تجھ کو لگا لوں، تو چلوں

پاس کچھ بھی تو نہیں، رخت سفر کیا باندھوں؟
چند اشکوں کے سوا، دیدہ تر، کیا باندھوں
کوئی بگڑی ہوئی تدبیر بنالوں، تو چلوں
میرے محبوب گلے تجھ کو لگا لوں، تو چلوں

دمِ رخصت ہے، مہم جو کو مہم ہے در پیش
کرنے رخصت مجھے آئے ہیں مرے خیر اندیش
آخری گیت انہیں اور سنا لوں، تو چلوں
میرے محبوب، گلے تجھ کو لگا لوں، تو چلوں!

WILLIAM BLAKE

(1757-1827)

ولیم بلیک

ولیم بلیک بھی اواخر اٹھارھویں صدی کا ایک قابل ذکر شاعر ہے جو انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بھی بقید حیات تھا۔ بلیک اگرچہ تعلیمی اعتبار سے کوئی عالم فاضل نہ تھا مگر اس نے اپنی ذاتی کوشش و کاوش سے کافی استعداد پیدا کرلی تھی۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ ایک عمدہ مصور اور نہایت ہنرمند کندہ کار تھا۔ کندہ کاری اس دور کے فنون لطیفہ میں ایک بلند مقام رکھتی تھی جس کے نمونے آج بھی نوادرات کی صورت میں عجائب خانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

بلیک کی نظمیں عموماً سادہ اور سبق آموز ہیں۔ اس لئے بلیک کو عام طور پر "بچوں کا شاعر" کہا جاتا ہے۔

ذیل میں بلیک کی مشہور نظم (To the Muses) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نظم اس نے 1783ء میں لکھی تھی جس میں اس نے اپنے معاصر شعراء کے بے لطف اور بے کشش کلام کا شکوہ کیا ہے۔ اس نظم کی دلاویزی کی تعریف کرتے ہوئے گولڈن ٹریژری کے مؤلف نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ بلیک کے اس شکوے کا اثر ہے کہ انیسویں صدی میں روائتی (Muses) نے انگلستان کو اس کے بہترین شعراء عطا کئے۔

(Muses) مغربی شاعری کی روایتی اصطلاح ہے۔ قدیم یونانی عقیدے کے مطابق نو فنون لطیفہ کی نو دیویاں ہیں جنہیں شعرائے مغرب اپنے روائتی انداز میں تائید غیبی حاصل کرنے کے لئے انہیں پکارا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری کی دیویوں کو اگر پکارا جائے تو وہ شاعر کو مزید وجدان عطا کرتی اور اس کے کلام میں معنویت اور کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اس نظم میں شاعران دیویوں سے براہ راست مخاطب ہے۔ ترجمہ کرتے وقت "Muses" کا کوئی مترادف مجھے اپنی روائتی شاعری میں نہیں ملا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ اس لفظ کو اسی طرح اردو میں نظم کر دیا جائے مگر ابھی تک جتنے تراجم میں کر چکا تھا ان میں اس قسم کی تلمیحات و اصطلاحات کو حتیٰ الامکان میں نے اپنی مشرقی روایات ہی کے موافق ادا کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے "Muses" کو میں نے اپنے مشرقی انداز میں "حسینان معانی" کہہ کر پکارا ہے تاکہ ۔

یوں تخت حسینان معانی اتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

اس نظم میں شاعر کا "Muses" سے شکوہ کرنے کا انداز بھی لائق توجہ ہے۔

ترجمہ

حسینانِ معانی

خیالستان ہومر میں خراماں
کہ محلات الف لیلہ میں ہو گم؟
ہو کس گلشن میں مثل بو پریشاں
حسینان معانی، ہو کہاں تم؟

ہو شاید آسماں پر محو پرواز
یا آب و گل کے پردوں میں نہاں ہو
کہ ہے خاموش فکر و فن کا وہ ساز
حسینان معانی، تم کہاں ہو

یا اقلیم سخن سے منہ کو موڑا
ازل سے کر کے اس پر حکمرانی
یقین آتا نہیں تم نے ہو توڑا
وہ رشتہ، اے حسینان معانی!

گئیں بھول اپنی وہ کافر ادائیں
وہ شان دلبری، وہ ناز و انداز
کہ ہیں بے کیف آج ان کی صدائیں
ہیں سُر اترے ہوئے، بے سوز ہے ساز

انیسویں صدی کے برطانوی شعراء

انیسویں صدی تاریخ برطانیہ کی سنہری صدی ہے۔ اس صدی میں اگرچہ برطانیہ کو بعض انتہائی نامساعد حالات اور سخت ترین مشکلات سے گذرنا پڑا لیکن قسمت نے ہربار یاوری کی اور ہر گرداب بلا سے وہ ایک نئی شان سے ابھر کر سربلند ہوا' یہاں تک کہ آخر صدی میں وسیع و عریض سلطنت برطانیہ میں کبھی آفتاب غروب نہ ہوتا۔ ایک طرف اقوام عالم میں برطانیہ کی یہ سیاسی برتری' تو دوسری جانب علم و فضل کے میدان میں اس کے مفکر' سائنسداں اور شعراء اپنے وطن کی عظمت کو چار چاند لگا رہے تھے۔ جس کے معترف و مداح برطانیہ کے حریف اس دور کے دوسرے یورپی ممالک بھی تھے۔

انیسویں صدی کے برطانوی شعراء کو واضح طور پر دو (2) ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ملکہ وکٹوریہ سے پہلے کا' رومانی شعراء کا دور' جس میں ورڈز ورتھ (Wordsworth) کولرج (Coleridge) اسکاٹ (Scot) سدے (Southey) بائرن (Byron) شیلے (Shelley) کیٹس (Keats) وغیرہ وغیرہ آتے ہیں۔ اور دوسرا' ملکہ وکٹوریہ کا عہد جو چونسٹھ سال (1837-1901) پر محیط ہے اور جسے مختصراً تین ذیلی ادوار (ابتدائی' درمیانی اور آخری) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جس میں ٹینی سن (Tenneyson) براؤننگ (Browning) تھامسن (Thompson) میریڈیتھ (Meredith) سوئن برن (Swinburne` کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم اور قابل ذکر شعراء اور شاعرات ہیں۔ اس مجموعے میں ان میں سے کئی چھوٹ گئے ہیں' لیکن پھر بھی خاص خاص شعراء اور شاعرات کے تراجم پیش کئے جا رہے ہیں۔

ROBERT SOUTHEY
(1774-1843)

رابرٹ سدے

رابرٹ سدے سے ہم انیسویں صدی کے بعض اہم شعرائے انگلستان کا آغاز کر رہے ہیں۔ سدے اپنے دور کے ممتاز شعراء میں شمار کیا جاتا ہے جسے اپنے عہد کا (Poet Laureate) "ملک الشعراء" ہونے کا شاہی اعزاز حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمہ وقت مطالعے اور تصنیف و تالیف میں اس قدر مستغرق رہتا تھا کہ صبح سے جو اپنی لائبریری میں داخل ہوتا تو رات گئے باہر نکلتا۔ آخری عمر میں کئی سال دیوانگی کے عالم میں گذار کر انتقال کیا۔ سدے ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کی ایک طویل نظم "لالہ رخ" (LalaRookh) اس کی مشرق پسندی کی عکاس ہے۔ اس کی مشہور نظم (The Cataract of Ladore) کانہایت خوبصورت ترجمہ اکبر الہ آبادی نے کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی جنہیں اختراع قوافی میں بدطولیٰ حاصل تھا رابرٹ سدے کے انتخاب قوافی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ یہ دونوں نظمیں آمنے سامنے رکھ کر پڑھنے کے لائق ہیں۔ یہاں اس کی مشہور نظم (The Scholar) کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

ترجمہ

اپنی لائبریری میں

رفتگاں عدم ہیں اور میں ہوں
نظر آتے ہیں مجھ کو چار طرف
عہد ماضی کے وہ عظیم دماغ
کاوشیں جن کی یادگار سلف
جو بڑھاتے ہیں دوستی کا ہاتھ
اور ہر اک وقت پر ہیں دیتے ساتھ

بخشتے ہیں خوشی میں اور خوشی
غم میں کرتے ہیں غم غلط میرا
اور جس وقت مجھ کو ہوتا ہے
فیض صحبت کا ان کی اندازہ
ہو کے ممنونیت مری بیدار
بھگو دیتی ہے اشکوں سے رخسار

ان کے زور قلم سے ماضی میں
جینے لگتا ہوں میں انہی کے ساتھ
ان کے فکر و نظر کی عینک سے
دیکھتا ہوں ہر ان کے عہد کی بات
باندھتا ہوں گرہ میں ان کے پند
بن کے شاگرداک سعادت مند

میری امیدیں ان سے وابستہ
ان کی صف میں مرا بھی ہوگا مقام
ان کی مانند میں بھی تابہ ابد
سدا آتا رہوں گا خلق کے کام
اور مرا نام رہتی دنیا تک
ماند پڑنے نہ دے گا اپنی چمک

WILLIAM WORDSWORTH
(1770-1850)

ولیم ورڈزورتھ

ورڈ ورتھ کا مقام انگریزی شاعری میں بے حد بلند ہے۔ اسے زمین سخن کا "کوہ پرشکوہ" کہا جاتا ہے جس نے رومانیت کو انگریزی شاعری میں ایک بار پھر مروج کر دیا۔ انگلستان کا یہ مایہ ناز شاعرلیک ڈسٹرکٹ (Lake District) میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ایک اٹارنی (Attorney) تھا۔ لیک ڈسٹرکٹ اپنی جھیلوں، پہاڑوں، سرسبز و شاداب پھولوں سے لہلہاتی وادیوں کے لئے پورے انگلستان میں شہرت رکھتا ہے۔ ورڈز ورتھ نے ابتدائی تعلیم کا زمانہ انہی حسین اور دلکش مناظر میں گزارا جن کی یادیں اس کے دل و دماغ میں نقش ہو کر رہ گئیں۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم مکمل کر کے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیمرج چلا گیا جہاں اس کی ملاقات کولرج (Coleridge) سے ہوئی اور انگلستان کے یہ دونون ہونے والے عظیم شاعر آپس میں گہرے دوست بن گئے اور ان کی یہ دوستی انگریزی شاعری کے لئے بڑی سود مند ثابت ہوئی۔

۱۷۹۰ء میں ورڈز ورتھ نے سوئزرلینڈ کی سیاحت کی۔ فرانس سے گذرتے ہوئے اس نے وہاں کے لوگوں میں انقلاب کا عجب جوش و خروش پایا، اور وہ ان کے انقلابی خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ انقلابی نظریات کی کشش اسے دوبارہ فرانس کھینچ لائی۔ یہاں شہراورلین (Orlean) کی ایک فرانسیسی

لڑکی سے اس نے شادی کرلی جس کے بطن سے اس کی ایک لڑکی پیدا ہوئی مگر اس عرصے میں اس کی جیب خالی ہو چکی تھی اور وہ روپیہ فراہم کرنے کے لئے وطن آنے پر مجبور ہوگیا۔ جب وہ روپیہ فراہم کر کے واپس فرانس جانے کی تیاری کر رہا تھا تو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور سلسلہ آمد و رفت یکبارگی منقطع ہوگیا۔ بہ ہزار دقت و خرابی جب وہ چھپ چھپا کر پیرس پہنچا تو ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ اسے اپنی بیوی کے پاس صحیح سلامت پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ خود اس کی جان ہر وقت خطرے میں تھی۔ آخر کار مجبور ہو کر اسے واپس انگلینڈ آجانا پڑا۔

۱۷۹۵ء میں اس کے ایک عزیز قریب کے مرجانے پر اس کی کچھ جائیداد اسے ترکہ میں ملی جس کی آمدنی پر وہ ایک اوسط درجے کی زندگی بافراغت گزار سکتا تھا۔ ورڈزورتھ کے حق میں یہ ایک ایسی نعمت تھی جس نے اسے ساری عمر کے لئے فکر معاش سے آزاد کردیا اور اب وہ صرف شاعری کر سکتا تھا۔ رابرٹ سدے کے انتقال کے بعد اسے انگلستان کا (Poet Laureate) ہونے کا شاہی اعزاز عطا ہوا۔

ورڈزورتھ کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں مگر جو خصوصیت ان سب میں نمایاں ہے وہ اس کا گہرا مشاہدہ فطرت اور حسن قدرت سے اس کا والہانہ لگاؤ ہے۔ جس کے باعث اسے ”شاعر فطرت“ (The Poet of Nature) کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ وہ قدرت کی کرشمہ سازیوں کو جن حسین لفظوں میں منظوم کرتا اور اپنے قاری کو اپنے جمالیاتی وجدان میں اپنے ساتھ شریک کرلیتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ ان صفحات میں ورڈزورتھ کی تین نظموں (Daffodils)، (Cuckoo) اور (Rainbow) کے تراجم پیش کئے جا رہے ہیں۔

ورڈزورتھ

ترجمہ

پھول ہی پھول

سیر کہسار میں تنہا صفت ابر رواں
محو نظارہ میں اک روز چلا جاتا تھا
ناگہاں جھیل کنارے نظر آیا وہ سماں
لہلہاتا ہوا اک منظر رنگین ایسا
جیسے پھولوں کی برات، ایک گلوں کا لشکر
دامن کوہ میں اترا ہوا تا حد نظر

پھول ہی پھول تھے اس طرح وہاں پھول ہی پھول
کہکشاں بچھ گئی تھی گویا سجا کر تارے
رنگ و بو تھے جو وہاں رقص میں باہم مشغول
پھول پھولے نہ سماتے تھے خوشی کے مارے
"اک مرقع تھا عجب چاک گریبانوں کا
شکل معشوق کی، انداز وہ دیوانوں کا" ؎

؎ روح ریاض خیر آبادی سے معذرت کے ساتھ

گل مرقع ہیں تیرے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز وہ دیوانوں کے
ریاضؔ

رقص میں پھول ادھر تھے تو ادھر تھیں امواج
یہاں پریاں سی' تھرکتی تھیں وہاں جل پریاں
شوخیاں ناز سے کرتے ہوئے وہ شوخ مزاج
گدگداتی جو صبا' چھوٹتی تھیں پھلجھڑیاں
تھی عجب بزم حسینان مرنجان و مرنج
کہ مجھے بخش دیا ایک گراں مایہ گنج

کیونکہ جب شومئی قسمت سے میں ہوتا ہوں ملول
اور تنہائی میں ہوتا ہے ہجوم افکار
تب مرے ذہن فسردہ میں کھل اٹھتے ہیں وہ پھول
یک بیک میری خزاں میں چلی آتی ہے بہار
پھر سے آراستہ ہوتی ہے گلوں کی محفل
اور پھر ناچنے لگتا ہے خوشی سے مرا دل

کوئل

(آزاد ترجمہ)

نے نواز بہار، اے کوئل
تو ہے طائر کہ اک فقط آواز؟
یا کوئی مطربہ پس محمل
مست و بے خود ہے زمزمہ پرداز؟

سن رہا ہوں میں تیری دہری تان
جو بیک وقت پاس اور ہے دور
باز گشت اس کی ہمنوا ہر آن
جس سے دو آتشنہ ہے کیف و سرور

گونج اٹھے ہیں وادی و کہسار
غنچہ و گل ہیں وجد میں رقصاں
فکر شاعر بھی جس سے باغ و بہار
ہے مضامین نو سے ایک سماں

کوک سے تیری اٹھ رہی ہے ہوک
یاد آتے ہیں بھولے افسانے
فصل گل کا روایتی وہ سلوک
چاک داماں کیے وہ دیوانے

تجھ کو طائر کا دوں میں کیونکر نام
اے نوائے شنیدہ نا دیدہ
تجھ کو شاعر کا شاعرانہ سلام
فسوں ہے تو، میں جس کا گرویدہ

تھی یہ بچپن سے آرزو مجھ کو
نظر آجائے کاش تیری جھلک
دیکھا کرتا تھا چار سو تجھ کو
پیڑ پتوں میں، گاہ سوے فلک

لیٹ کر، بیٹھ کر، کھڑے ہو کر
کبھی میداں میں، گہ سر کہسار

دل میں حسرت ہی رہ گئی یہ مگر
نہ ہوا آج تک ترا دیدار

آج بھی سن رہا ہوں تیری کوک
کیف و مستی وہی ہے جس کی ہنوز
آج بھی جس سے دل میں اٹھتی ہے ہوک
وہی ساز اس کا اور وہی ہے سوز

اے کہ جان بہار، شان بہار!
چھیڑ دی تو نے کونسی یہ غزل؟
وجد کرتے ہیں وادی و کہسار
سن کے پھر باز گشت ساز ازل

قوس قزح

(آزاد ترجمہ)

جب دیکھتا ہوں چرخ پہ قوس قزح کے رنگ
اٹھتی ہے خود بخود مرے دل میں عجب ترنگ
طفلی میں دیکھتا تھا اسے جیسا دلفریب
ہو کر جواں ہوں پا رہا ویسا ہی دیدہ زیب
پیری میں بھی میں دیکھوں گا اس کو اسی طرح
رنگیں وہ قوس اور وہ رنگینیٔ قزح
اس دلکشی میں فرق نہ آئے گا حشر تک
پھیکے پڑیں گے رنگ یہ ہرگز نہ یہ نکھار
دامن کو اس کے چھو نہ سکے گا کوئی غبار
حسن ازل کی ہے یہ جھلک چرخ پر دھنک
جس میں عیاں ہے حسن کی پاکیزگی کا عکس
جو دے رہا ہے صدق و صفا کا حسین درس

سیموئیل ٹیلر کولرج

SAMUAL TAYLOR COLERIDGE

(1772-1834)

ورڈز ورتھ کے باب میں تھوڑا سا ذکر کولرج کا کیا جا چکا ہے کہ یہ دونوں کیمرج (Cambridge) میں ایک ساتھ تھے اور باہم گہرے دوست۔ دونوں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے۔ کولرج بذات خود بڑا ذہین اور اپنے وقت کا صاحب طرز شاعر تھا۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا وسیع مطالعہ رکھتا تھا۔ اس نے انگریزی شاعری کے عروض میں لغوی تلفظ کے لحاظ سے ادا کی جانے والی حرکات Syllables کے بدلے انگریزی لہجے میں مروجہ صوتی انداز Accents کو رائج کیا۔ جو وقت کی ضرورت کے پیش نظر فوراً قبول کر لیا گیا۔ کولرج کا یہ اجتہاد انگریزی شاعری میں قابل ذکر اہمیت کا حامل ہے۔

کولرج افیون کا عادی ہو گیا تھا اور شعر گوئی کی وجدانی کیفیت اپنے اوپر طاری کرنے کے لئے اس نشے کا سہارا لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی بیشتر معرکہ آرا نظمیں اسی عالم بے خودی کی پیداوار ہیں۔ ذیل میں اس کی مشہور نظم "کبلا خان" (Kubla Khan) کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس کے متعلق مصدقہ شواہد موجود ہیں کہ اس نے یہ نظم اسی عالم بے خودی میں لکھی تھی۔ بہرحال اس کا ترجمہ عین عالم بیداری اور قطعی ہوش و حواس میں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کولرج

ترجمہ

کبلا خان

دشت ژانادو جو کبلا خان نے فرمایا پسند
قصر سلطانی کی دیواریں لگیں ہونے بلند
اک طرف جس کے پہاڑ اور گھاٹیاں وہ پر خطر
آج تک جن میں ہوا ممکن نہ انساں کا گذر
دوسری جانب مقدس ایلف موجیں مارتا
اژدھے کی طرح بل کھاتا ہوا پھنکارتا
ہے سما جاتا اندھیرے غار میں زیر زمین
جس کی منزل کوئی بے سورج سمندر ہے کہیں

جھک گئے اونچے پہاڑ' ابھریں وہ گہری گھاٹیاں
وحشتیں رخصت ہوئیں دیکھا جو یہ بدلا سماں
رخ سے گھونگھٹ کو الٹ کر اک ادائے ناز سے
مسکرائی دشت کی دیوی عجب انداز سے

دیکھتے ہی دیکھتے جنگل میں منگل ہوگیا
سال بھر میں پورا منصوبہ مکمل ہوگیا
کھنچ گئی چوگرد اک مضبوط و مستحکم فصیل
سلسلہ پھیلا تھا جس کا دور تک سات آٹھ میل
برجیاں، مینار، لہراتے ہوئے شاہی نشاں
روزنوں پر ان کمیں گاہوں کے چوکس پاسباں
اور اندر کا سماں، گویا طلسم سامری
تھی عجب ذوق جمالیات کی جلوہ گری
جنگجویانہ فضا، وہ اک مہم جو کی پسند
دشت و دریا، کوہ و صحرا جس کے اندر قلعہ بند
تھے سروں پر کج کئے کہسار برفانی کلاہ
حیرت و ہیبت سے رہ جاتی جنہیں تکتی نگاہ
ایسی بے ہنگم چٹانیں، گہرے منہ کھولے وہ غار
دیکھتے ہی دل دہل جائیں جہاں بے اختیار
اک طرف تو یہ مناظر پر خطر وحشت اثر
دوسری جانب عجب صناعی دست بشر
رنگ و بو کی بزم میں اٹھکھیلیاں کرتی بہار
وہ چہکتی بلبلیں اور وہ مہکتے سبزہ زار
رقص میں ہر لالہ و گل، گنگناتی جوئے آب
پتے پتے پر جوانی، بوٹے بوٹے پر شباب
مرمریں تالاب میں وہ ناز فرماتے کنول
جلترن پر اپنے فوارے کوئی گاتے غزل

اک طلسماتی فضا، اک سحر ساماں سر زمیں
اور وہ ان کے درمیاں عشرتگہ خاقان چیں

اور شب تاریک میں ہر ماہ کی اک ماہرو
اک پہاڑی پر نظر آتی ہے گریاں چار سو
ایلف کی موجوں میں ہوجاتی ہے گم پھر ایک بار
اور نگل جاتا ہے پھر اس کو کوئی تاریک غار
اور بڑھ جاتی ہے تاریکی اندھیری رات کی
گنگ ہوجاتی زبانیں منھ میں ہیں لمحات کی
ہو کا عالم ہر طرف، کرتا وہ جنگل بھائیں بھائیں
سنسنی، پر ہول سناٹا، ہوا کی سائیں سائیں
دفعتہً اک شور اٹھتا اور آوازیں مہیب
چیختی بڑھتی چلی آتیں شبستان کے قریب
اور پر اسرار اس غل میں وہاں اک تاجدار
سن لیا کرتا نوید فتح پیش از کار زار

جب جھروکے سے افق کے جھانکتی پہلی کرن
نوبتیں بجتیں، نکھرتے دشت و در، کوہ و دمن
قصر سلطانی میں پھر بیدار ہوتی زندگی
مسکراتی، دل لبھاتی، ناچتی، گاتی ہوئی
گونجتے ساز سحر ہر سمت جیسے نغمہ بار
ننھی ننھی شہد کی بوندوں کی مترنم پھوار

ساز کا وہ زیروبم نغمات کا وہ کیف و کم
رقصاں رنگیں پیشوازوں میں حسینان حرم
ہر طرف اہل طرب' ہر سمت خدام ادب
منفرد منظر ہر اک ، انداز ہر اک منتخب
خلوت خاقان چیں' فردوس بروئے زمیں
جس کے بام و در صدا دیتے "ہمین است و ہمیں"

لرزاں موجوں میں وہاں عکس شبستان شہی
واژگوں آتا نظر اور سرنگوں سرو و سہی
تیرتا وہ اک معلق قلعہ سطح آب پر
وہ سکڑتے پھیلتے لحظہ بہ لحظہ بام و در
بیکراں وہ غیر متناسب خطوط اور دائرے
مضطرب اک قید سے آزاد ہونے کے لئے
اور کبلا خاں بنا لیتا ہوا میں اک محل
ہو نہ بیرونی عوامل کا جہاں دخل و عمل

SIR WALTER SCOTT

سروالٹر اسکاٹ (1771ء تا 1823ء)

وہ ایڈنبرا کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے بڑا ذہین تھا۔ والدین نے اس ہونہار بیٹے کو قانون کی اعلیٰ تعلیم دلوائی مگر اسکاٹ نے وکالت کی بجائے قلم و قرطاس کا مشغلہ پسند کیا۔ شعر موزوں کرنے کی خداد داد صلاحیت تھی۔ اپنے وطن سے والہانہ محبت کے ساتھ انگریز اساتذہ شعراء کا بھی مداح تھا۔ ڈرائیڈن کا کلام یکجا کر کے اپنے سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس نے اسکاٹ لینڈ کی بعض قدیم روایتی حکایات کو بیلڈ (Ballad) کی صورت میں منظوم کیا جنہیں 1802ء میں (Minstrelsy of Scottish Barder) کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ نظمیں نہ صرف اسکاٹ لینڈ بلکہ انگلینڈ میں بھی پسند کی گئیں۔ اس کامیابی کے بعد اس کی دو طویل نظمیں (Lay of the Last Minstrel) 1805ء میں اور دوسری (The Lady of the Lake) 1810ء میں چھپ کر منظر عام پر آئیں جنہوں نے اسکاٹ کو ماہر انگریز شعراء ورڈزورتھ اور کولرج کی صف میں کھڑا کر دیا۔

نظم کے علاوہ نثر میں بھی اس نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کے جوہر دکھائے۔ ناول نگاری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔ تاریخی پس منظر میں ناول پیش کرنا اس کی جدت فکر تھی جس کے سبب اسے تاریخی ناول نگاری کا موجد مانا جاتا ہے۔ ذیل میں اسکاٹ کی نظم (Lay of the Last Minsterl) کے ایک مختصر حصہ کا منظوم ترجمہ "حب الوطنی" کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔

حب الوطنی کے موضوع پر فارسی کی ایک رباعی یاد آگئی وہ بھی یہاں درج کرنے کے لائق ہے۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر پادشاہی میکرد
میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

سروالٹر اسکاٹ

(ترجمہ)

حب الوطنی

جو نہیں جذبۂ حب الوطنی سے سرشار
روح مردہ ہے وہ، جس کا نہیں کوئی کردار
کبھی جس ننگ وطن نے نہ لیا نام وطن
دیس کی یاد نہ پردیس میں آتی ہو کبھی
جس کو واپس وطن آنے کی نہ ہوتی ہو خوشی
ہوگا ایسا بھی جہاں میں کوئی؟ اے چرخ کہن
اور جو ہو واقعی ایسا ہی کوئی فرد بشر
گرچہ ہو کیسا ہی عالی نسب و صاحب زر
ہوگی دنیا میں کبھی اس کی نہ دل سے عزت
طبع شاعر پہ گراں گزرے گی اس کی مدحت
دیکھ لے گا اسی دنیا میں وہ اپنا انجام
نام اس کا لیا جائے گا بجائے دشنام
دین و دنیا میں وہ مردود ہے دہرا مردار
وہاں مار اس پہ خدا کی، یہاں سب کی پھٹکار
مرگ پر اس کی کوئی سوگ نہ کوئی ماتم
ہوگا ہر لب پہ جہاں پاک ہوا اور خس کم

LORD BYRON

(George Gordon Noel)

(1788-1824)

لارڈ بائرن

شعرائے انگلستان میں لارڈ بائرن کا نام ہی عجب شاعرانہ رومانیت کا حامل ہے اور اس کی زندگی ایک رومانی نظم۔ وہ بڑا وجیہہ صورت شخص تھا مگر ایک پاؤں میں پیدائشی عیب لیے ہوئے جس کا اسے شدت سے احساس تھا اور حتی المقدر اس کی پردہ پوشی کرتا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کا تعلق خاندان امراء سے تھا۔ اس کی ماں اسکاٹ لینڈ کی ایک امیرزادی تھی اور ایک بڑی جائیداد کی وارث، مگر اس کے باپ نے بیوی کی جائیداد تباہ کرڈالی۔ بائرن ابھی تین برس کا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا جب دس برس کا ہوا تو بڑے چچا کے انتقال پر اسے لارڈ بائرن بنایا گیا۔ ۱۷۹۸ء میں ماں کی سرپرستی میں موروثی جائیداد پر وہ قانوناً قابض و متصرف ہوا۔ ابتدائی تعلیم ہیرو (Harrow) میں ہوئی جہاں آج بھی بڑے بڑے لوگوں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ کہتے ہیں اسی ہیرو میں جواہر لعل نہرو اور معزول شاہ برطانیہ ایڈورڈ ہشتم اپنے بچپن میں ہم جماعت تھے۔

۱۸۰۸ء میں کیمرج سے فارغ التحصیل ہوکر وہ جنوبی یورپ کی سیروسیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ لزبن، کیڈز، جبرالڑ، مالٹا، البانیہ، اٹلی، ایتھنز، قسطنطنیہ، سمرنا میں

قیام کرتا ہوا ۱۸۱۱ء میں وطن واپس آیا۔ سیروسیاحت کے دوران اپنے گردوپیش جن حالات نے اسے متاثر کیا انھیں ایک خوبصورت سلسلہ وار نظم (Childe Herald's Pilgrimage) میں منظوم کرتا رہا۔ جونہی یہ نظم شائع ہوئی اس نے بائرن کو بام شہرت پر پہنچادیا۔ اس کا تذکرہ بائرن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ایک صبح میں بیدار ہوا تو خود کو مشہور پایا"۔

"I awoke one morning and found myslef famous." (Byron)

دوسرے سال اس نے دارالامراء (House of Lords) میں اپنی پہلی تقریر (MaidenSpeech) کی جس میں سیاسی آزادی کی حمایت میں کچھ ایسے مدلل اور موثر انداز میں لب کشائی کی کہ سارے براعظم یورپ میں اس کی دھوم مچ گئی اور اس زمانے کے فرانس، جرمنی، اٹلی، اسپین اور روس کے بڑے بڑے شاعراور دانشور بائرن کے انقلابی خیالات سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کے اپنے دور میں جتنی شہرت اور مقبولیت غیر ممالک میں بائرن کو حاصل ہوئی اس سے پیشتر کسی انگریز شاعر کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ ادھراس کی کوئی نظم شائع ہوتی اور ادھر ساری یوروپی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوجاتا۔

بائرن جب کہ اپنے پورے عروج و کمال پر تھا ۱۸۱۵ء میں اس نے ایک امیر زادی سے شادی کرلی مگر سال بھر کے اندر ہی میاں بیوی میں مفارقت ہوگئی۔ اس شادی سے ان کے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ لوگوں نے بائرن ہی کو قصوروار ٹھہرایا اور اس کی بڑی بدنامی ہوئی جس سے تنگ آکر ۱۸۱۶ء میں اس نے انگلینڈ چھوڑ دیا اور بلجیم، فرانس، جرمنی ہوتا ہوا وہ سوئزرلینڈ پہنچا جہاں کئی سال گزارے۔ جنیوا میں اس کی ملاقات شیلے سے ہوئی اور دونوں گہرے دوست ہوگئے۔ پھر وہ اٹلی چلا آیا اور وینس، روم اور پیسا میں مقیم رہا۔ پیسا سے ایک ادبی رسالہ "دی لبرل" جاری کیا اور شیلے کی وساطت سے اس عہد کے مشہور

انگریز صحافی لے ہنٹ (Leigh Hunt) کی خدمات اس رسالہ کو ترتیب دینے کے لیے حاصل کیں۔ اسی زمانے میں یونان جس پر عرصے سے ترکوں کی حکمرانی تھی اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ بائرن یونان کی آزادی کا پرجوش حامی تھا اپنی حمایت کا عملی ثبوت دیتے ہوئے وہ یونانی افواج میں شامل ہوگیا جہاں پہنچ کر اچانک وہ سخت بیمار پڑگیا اور میدان جنگ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ذیل میں لارڈ بائرن کی دو مشہور نظموں کے تراجم ہدیہ ناظرین ہیں :۔

(When We Two Parted)

ترجمہ

ایک گم گشتہ سے

ہائے جس دم جدا ہوئے تھے ؛
بجنوشی و دیدہ پرنم !
دل پہ تھا اک ہجوم حزن و ملال
ٹکڑے ٹکڑے جگر تھا غم سے کمال
زرد تھے، سرد تھے ترے رخسار
سرد تھیں گرم جوشیاں یک بار
راس آئیں نہ وہ ملاقاتیں
ہائے کیا دن تھے اور کیا راتیں !

شبنم صبحدم تھی اشک فشاں
اور آنسو تھے میرے رخ پہ رواں
میرا ماتھا جبھی سے ٹھنکا تھا
یہ شگوں کوئی گل کھلائے گا

تو نے عہد وفا کو توڑ دیا
رسم الفت سے منہ کو موڑ لیا
سن کے رہ جاتا ہوں میں تیرا نام
کہ وہ آغاز اور یہ انجام

لوگ کرتے ہیں تذکرہ تیرا
اور اڑاتے ہیں مضحکہ میرا
فرط غم سے میں جاگزرتا ہوں
اور تجھے چاہتے بھی ڈرتا ہوں
راز دل اپنا کوئی کیا جانے
کون تجھ کو مرے سوا جانے
بھول سکتا نہیں دل ناشاد
اب مری زندگی ہے تیری یاد

سب سے پوشیدہ وہ ملاقاتیں
اور وہ راز و نیاز کی باتیں
رہ گئیں ہوکے صرف خواب و خیال
زندگی ہے بغیر تیرے محال
کاش بچھڑے ہوئے جو مل جائیں
گزرے لمحات کاش لوٹ آئیں
لوں تجھے بڑھ کے پھر میں ہاتھوں ہاتھ
خامشی اور آنسوؤں کے ساتھ

(آزاد ترجمہ)

کامرانی

مت لو میرے آگے نام بڑا کسی کہانی کا
عہد کامرانی ہے نام نوجوانی کا
مظہر شباب وحسن، فصل گل کے خودرو پھول
دیکھو رنگ و بو سے خراج کیسے کر رہے ہیں وصول

جھریوں پہ پھولوں کے ہار لگتے ہیں ایسے
سوکھے پھول پر شبنم اشکبار ہو جیسے
پُر بغیر سج دھج کے پُرفسوں جوانی ہے
منتظر اشارے کی جس کے کامرانی ہے

اے مئے نمود و نام، کیف آفریں ترے جام
پر سوا ہے ان سے بھی چشم ناز کا انعام
ان حسین نگاہوں کا پوچھئے نہ کیف و سرور
جو خلوص کا اظہار کررہی ہوں اور بھرپور

ان کی نظر استحسان، ان کے لب پہ میرا نام
اس سے بڑھ کے کیا ہوگا میرے واسطے انعام
ہے محبت محبوب راز کامرانی کا
اور کامرانی ہے تاج نوجوانی کا

پرسی بائش شیلے

PERCY BYSSHE SHELLEY

(1792-1822)

پرسی بائش شیلے ایک متمول زمیندار کا بیٹا تھا۔ ائین (Eton) کے مشہور اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے آکسفورڈ میں داخلہ لیا۔ یہاں تھوڑا ہی عرصہ گزارا تھا کہ ایک ایسی آزاد خیال نظم لکھنے پر جس میں مذہب پر حملے کئے گئے تھے۔ اسے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے غیرمذہبی خیالات کی بناء پر اس کی منگیتر نے بھی اس سے رشتہ توڑ لیا اور اس کی آزاد خیالی کے باعث اس کا باپ بھی اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

۱۸۱۱ء میں وہ ایک سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ فرار ہوگیا۔ کچھ دنوں وہ روپوش رہے، پھر اسکاٹ لینڈ جاکر، جہاں کا قانون اس عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ شادی کر کے وہ انگلینڈ واپس آئے اور کچھ عرصہ لیک ڈسٹرکٹ (Lake District) میں مقیم رہے جہاں اس کی ملاقات ورڈز وتھ، کولرج اور سدے سے ہوئی۔ ابتدا میں وہ سدے سے خاص طور پر متاثر تھا اور اس کی شاعری کو بیحد پسند کرتا تھا۔ مگر اس کے

انقلابی خیالات کی تشفی ان بڑے شعراء سے نہ ہوئی اور اس کی آزاد روی کا سدے جیسے قدامت پسند سے نباہ نہ ہوسکا۔ وہ اس دور کے مشہور آزاد خیال مفکر گوڈون (Godwin) کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔ گوڈون کی تصنیف "سیاسی انصاف" (Political Justice) نے اس زمانہ کے بڑے بڑے برطانوی دانشوروں کو متاثر کیا تھا۔ جن میں ورڈزورتھ جیسے لوگ شامل تھے۔ نوجوان شیلے بھی اس سے بیحد متاثر تھا۔ اور اس نے گوڈون کے نظریات کی اشاعت پر کثیر رقم خرچ کی۔ ۱۸۱۵ء میں شیلے کے دادا کا انتقال ہوا جس نے اس کے لیے ایک ہزار پونڈ سالانہ کا ترکہ چھوڑا۔ اسی اثناء میں وہ گوڈون کی رشتہ دار ایک سولہ سالہ لڑکی کے ساتھ فرار ہوگیا۔ پیرس پہنچ کر اس نے اپنی پہلی بیوی کو بھی اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی۔ مگر وہ انگلینڈ ہی میں مقیم رہی۔ سوئزرلینڈ میں اس کی ملاقات بائرن سے ہوئی اور دونوں گہرے دوست ہوگئے۔ اس عرصے میں اس نے بہت سی نظمیں لکھیں جو نوجوانوں میں بڑی مقبول ہوئیں۔ لیکن مذہب کے خلاف اس کے عقائد کے باعث ناشرین کو اس کا کلام شائع کرنے میں تامل ہوتا۔ اسی دوران میں اس کی پہلی بیوی کا انگلینڈ میں اچانک انتقال ہوگیا۔ بیوی کی موت پر وہ وطن آیا مگر یہاں اس کو سخت ناپسند کیا گیا اس لئے وہ جلد ہی واپس چلا گیا۔ اب وہ اس دوسری لڑکی کے ساتھ جسے لیکر وہ فرار ہوگیا تھا اور جو اس وقت سے اس کے ساتھ ہی رہتی تھی قانوناً شادی کرسکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شادی کرلی۔ مگر اب اس کی صحت جواب دے رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے دق تشخیص کیا اور ان کے مشورے پر اس نے کئی سال جنوبی یورپ کے صحت افزاء مقامات پر گزارے۔

اس دوران میں اس نے اپنی کئی شاہکار نظمیں لکھیں ۱۸۲۱ء میں کیٹس (Keats) کی موت پر اسے سخت صدمہ ہوا جس کا اظہار اس نے کیٹس کے

مرثیہ میں کیا ہے۔ زمانے کی بے حسی اور شاعر کی ناقدری کا نہایت موثر انداز میں رونا رویا ہے۔ جس کا وہ خود بھی شکار تھا۔ دوسرے سال وہ بھی سمندر میں کشتی ڈوب جانے کے حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اگرچہ اس کے زمانے میں اس کی قدر نہیں کی گئی مگر مرنے کے بعد اسے بیحد سراہا گیا۔ اور آج اسے انگلستان کے بہترین شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔

ذیل میں شیلے کی مشہور نظم "To a Skylark" کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ میں نے "اسکائی لارک" کا ترجمہ "پپیہا" کیا ہے جو میں جانتا ہوں کہ غلط ہے مگر ایک تو اسکائی لارک ہماری آب وہوا میں نہیں پایا جاتا اور ہم اس سے ناواقف ہیں اور دوسرے یہ کہ اس سے ملتے جلتے پرند مثلاً لوا' چنڈول وغیرہ جیسے الفاظ میں کوئی شعری لطافت وجاذبیت نہیں ہے جبکہ "پپیہا" ہماری روایات شاعری میں ایک رومانی تاثر کا حامل ہے اور جس کی "پی کہاں!" میں سوز و سرور کی ایک عجیب کیفیت ہے۔

ترجمہ

پپیہا

اے پپیہے، اے سروش سرخوشی!
کس قدر دلکش ترا یہ ساز ہے
عرش کی کوئی سریلی بانسری
فرش پر یا زمزمہ پرداز ہے
یا مرے ہی دل کی تو آواز ہے؟

ہاں بلند، اے طائر رفعت پسند!
ہم صفیر طائر فکر رسا
پیکر پرواز و آواز اوج مند
یوں ہی اڑتا جا تو یونہی گائے جا
آگ سینوں میں لگا دے مطربا!

فن میں اپنے گم وہ فنکار عظیم
جس کی ہر تخلیق تازہ شاہکار
اک نوائے نو پئے ذوق سلیم
دل سے نکلی اور ہوئی جو دل کے پار
ہاں وہی قند مکرر بار بار

شام کا منظر غروب آفتاب
اور شفق کی وہ سنہری سرخیاں
شعلہ ساماں جن میں مانند سحاب
اک نوائے آتشیں ہے پرفشاں
"پی کہاں!" کی دھن میں سرگرم فغاں

رقص میں جس طرح رقاص فلک
گنبد گردوں میں یوں رقصاں مدام
ہے کبھی دکھلا رہی اپنی جھلک
اور کبھی چھپ کر کہیں بالائے بام
پھر کوئی دیتی ہوئی تازہ پیام

یا وہ افسانوں کی شہزادی ہے تو
تک رہی ہے جو کسی دلبر کی راہ
اپنے زخم دل کی ہے فکر رفو

اک غزل کی ڈھونڈ لیتی ہے پناہ
نغمہ شیریں میں ڈھل جاتی ہے آہ

یا کوئی نغمات کی قوس قزح
نغمے رنگا رنگ برساتی ہوئی
بھر کے رنگ آہنگ میں کچھ اس طرح
راگ میں رنگ اپنا دکھلاتی ہوئی
لہر سی لہروں میں لہراتی ہوئی

ایک شاعر کی صفت عزلت گزیں
آپ ہنگامہ پہ ہنگاموں سے دور
کہہ رہا ہو اپنی رو داد حزیں
مضطرب ہر شعر میں جس کا شعور
جس سے برپا ہر طرف شور نشور

یا کوئی اک نرم و نازک سی کلی
پتیوں کی سیج پر تھی محو خواب
ناگہاں موج صبا کی گدگدی
عارضوں میں اس کے چھلکا کر شراب
دے رہے ہیں لوریاں حسن و شباب

یا کوئی اک مہ نگار و مہ جبیں
اپنے صحن باغ میں محو خرام
گنگناتی ہو بہ لحن دلنشیں!
مست و بیخود ہو کے خود اپنا کلام
وجد میں عالم کا عالم ہو تمام

آہ اے مرغ ہوا! کچھ تو بتا!
کس سے سیکھا ہے یہ انداز سخن
کاش کچھ مجھ کو بھی کردے تو عطا
طرز فکر اپنی کچھ اپنا بانکپن
گونج اٹھے جس سے چمن اندر چمن

فکر اپنی ہے فقط وہم و قیاس
ذکر اپنا درد دل کی داستاں
قہقہوں پر خندہ زن اندوہ و یاس
ہیں ہمارے گیت فریاد و فغاں
شعر کی شیرینیت ہیں تلخیاں

ہاں سکھا دے اپنا انداز جنوں!
ہاں بتادے اپنے فن کا مجھ کو راز
گرد کو ان رفعتوں کی پاسکوں
گونجتا ہے جن میں ملکوتی وہ ساز
دل نشین و دلفریب و دلنواز

اور اب شیلے کی ایک چھوٹی سی نظم (Threnos) بمعنی "نوحہ غم" کا منظوم ترجمہ اسی عنوان سے پیش خدمت ہے۔ شیلے کی یہ پرسوز نظم اوریجنل رائم اسکیم میں ترجمہ کی گئی ہے۔

نوحہ غم

آہ ، اے دنیائے دوں ، اے وقت اور اے زندگی !
کیا دیا تم نے بجز محرومی و بیچارگی؟
اور اب ، کہ منتظر میری ہے آغوش زمیں
کیا مری قسمت میں ہے اک بار تھوڑی سی خوشی ؟
اب کبھی ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں !

آہ ، عہد شادمانی کس قدر تھا مختصر
جیسے اک جھونکا صبا کا آن کر جائے گزر
یوں فلک نے میری گلشن کی بہاریں لوٹ لیں
کیا بہار آئے گی پھر میرے چمن میں لوٹ کر ؟
اب کبھی ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں !

جان کیٹس

(JOHN KEATS)

(1795-1821)

جان کیٹس لندن میں پیدا ہوا، جہاں اس کا نانا ایک سرائے اور اصطبل کا مالک تھا اور یہ کاروبار اس کے باپ کے سپرد تھا۔ ابھی کیٹس دس برس کا تھا کہ نانا کا انتقال ہوگیا اور سارا کاروبار اس کے باپ کے ہاتھ میں آیا۔ مگر اسی سال باپ بھی ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ ماں نے دوسری شادی کرلی۔ موروثی جائیداد اور کاروبار میں عزیز واقارب کے درمیان تنازعہ ہوا اور نوبت مقدمہ بازی تک پہونچی۔ اس اثناء میں کیٹس لندن چھوڑ کر اپنی بیوہ دادی کے پاس اندرون ملک چلا گیا۔ وہاں ایک اسکول میں اسے داخل کردیا گیا۔ ابتداء میں وہ ایک اچھا طالب علم ثابت نہ ہوا۔ لیکن جب وہ چودہ سال کا ہوا تو یکبارگی تبدیل ہوگیا۔ اب وہ بہت دل لگا کر پڑھتا اور محنت کرتا۔ چنانچہ اس دوران میں اس نے کئی تعلیمی مقابلے جیتے اور انعامات حاصل کئے۔ مگر دوسرے ہی سال اس کی ماں مر گئی اور کیٹس ایک مقامی ہسپتال میں نوکر ہوگیا۔ اس کے باوجود وہ اسکول میں پڑھتا رہا۔ اس عرصے میں اپنے بعض ہم عمر دوستوں کی صحبت میں اسے شاعری کا شوق ہوا۔ اور وہ شعر کہنے لگا۔ ۱۸۱۵ء میں وہ لندن چلا آیا اور یہاں ایک ہسپتال میں کام سیکھنے لگا۔ مگر اب شاعری اس کی رگ رگ میں رچ بس گئی تھی۔ اس نے کلاسیکی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا اور کلاسیکی

شعراء کے اسلوب میں سانٹ اور نظمیں لکھنی شروع کیں۔ ۱۸۱۶ء میں لے ہنٹ (Leigh - Hunt) کے حلقۂ شعرا و ادبا سے متعارف ہوا۔ جن میں شیلے بھی تھا۔ لے ہنٹ نے اپنے ایک اداریئے میں نوجوان کیٹس کی شاعری کی دل کھول کر داد دی۔

کیٹس کی شخصیت بڑی دلکش اور پر وقار تھی۔ کلاسیکی نقوش چمکیلی آنکھیں اور سرخی مائل گھنے سنہری بال۔ قد اگرچہ ۵ فٹ تھا مگر کچھ ایسا موزوں و متناسب کہ وہ پستہ قد معلوم نہ ہوتا۔ ۱۸۱۶ء میں جبکہ اس کی عمر صرف اکیس سال تھی اور وہ رائل کالج آف سرجنز کا ایک طالبعلم تھا جہاں سے فارغ التحصیل ہونے میں صرف چند سال باقی تھے' اس نے خود کو زندگی کے ایسے دوراہے پر کھڑا پایا جہاں وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آیا اسے ایک سرجن بننا چاہیئے یا ایک شاعر اور اس کے جمالیاتی شعور نے فیصلہ شاعری کے حق میں صادر کردیا۔ اپریل ۱۸۱۷ء میں رائل کالج آف سرجنز کو خیرباد کہہ کر وہ خاموشی اور سکون سے شعر کہنے کے لئے لندن سے اندورن ملک چلا گیا۔ تھوڑے عرصے میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ مگر اس دور کے ناقدین نے بری طرح اس کا مضحکہ اڑایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ شاعری پر وقت ضائع کرنے کی بجائے ہسپتال کو لوٹ جائے اور مرہم پٹی کرنے کی تربیت مکمل کرے۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کا دوسرا مجموعہ بھی شائع ہوگیا۔ مگر اس کی بھی پذیرائی نہ ہوئی۔ اس دوران میں اس نے ورڈز ورتھ سے ملاقات کی مگر انگلستان کے اس عظیم شاعر نے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کچھ دنوں وہ ہیزلٹ (Hazlitt) کے لکچروں میں بھی شرکت کرتا رہا' جو وہ مشہور نقاد اپنی قیام گاہ پر شاعری کے موضوع پر دیا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اپنی تنہائیوں اور خاموشیوں میں لوٹ گیا۔ جہاں اس نے اپنے تیسرے اور چوتھے مجموعوں کو

مکمل کیا۔ ۲۰۔۱۸۱۸ء کے عرصے میں کیٹس نے اپنی بہترین نظمیں پیش کیں مگر نقادوں نے ان سب پر جارحانہ تنقید کی۔ اسی اثناء میں اس کی صحت خراب ہوگئی۔ یہاں تک کہ وہ خون تھوکنے لگا۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور تبدیلی آب وہوا کے لئے اٹلی کے صحت افزاء مقامات پر کچھ عرصہ قیام کرنے کی رائے دی۔ چنانچہ اس کا ایک عزیز دوست اسے اپنے ہمراہ اٹلی لے گیا۔ جہاں ایک سال تک زندگی اور موت کی کش مکش میں گزار کر وہ راہی عدم ہوا۔ کیٹس کی موت پر شیلے نے بڑا دردناک مرثیہ لکھا۔ بائرن نے کیٹس کی موت کا ذمہ دار نقادوں کو ٹھہرایا۔ فی الحقیقت اس نوجوان شاعر کی موت بڑی حسرتناک تھی جس نے شاعری کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیا۔

کیٹس کے معاشقات میں تین لڑکیوں کا نام آتا ہے جن میں فینی برانے (Fanny Brawne) خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اس لڑکی سے وہ بے پناہ محبت کرتا تھا۔ دونوں کی منگنی بھی ہوچکی تھی۔ اور انھیں صرف اس کا انتظار تھا کہ کیٹس صحت یاب ہوجائے تو دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوجائیں۔

ذیل میں کیٹس کی مشہور نظم (Ode on a Grecian Urn) - کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے "ارن" (Urn) پرانے زمانے میں ایک برتن ہوتا تھا۔ قدیم یونانی اور رومی جو اپنے مردوں کو جلایا کرتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی راکھ احترام سے اس برتن میں محفوظ کرلیا کرتے اور اسے اپنے گھروں میں سجالیا کرتے تھے۔ چونکہ "ارن" سامان آرائش میں سمجھی جاتی تھی اس لئے اس پر طرح طرح کے نقش ونگار اور مختلف مناظر اس خوبصورتی سے کندہ کئے جاتے جن میں فنکار اپنا پورا ہنر صرف کردیتا۔ غالبا یونان قدیم کے کسی ایسے ہی فن پارہ نے شاعر کو متاثر کیا اور اس نے یہ خوبصورت نظم لکھ دی۔

(Ode on a Grecian Urn)

(آزاد ترجمہ)

ایک خاک دان یونانی پر

اے سدا دلہن! وہی ہے حسن تیرا اور شباب
ہے زبان حال میں ماضی کی تو گویا کتاب
یہ منقش بیل بوٹے، مرد و زن، پیر و جواں
کہہ رہے ہیں آج بھی عہد کہن کی داستاں
غیر فانی دیوتا ہیں اور کہیں فانی بشر
سربہ سجدہ عبد معبودوں کی قرباں گاہ پر
ہیں کہیں دوشیزگان خوبصورت خوب رو
اور کہیں ہیں نوجوانان مسلح جنگجو
ہے کہیں سیف و سناں اور ہے کہیں جام و سبو
اور کہیں چنگ و رباب و مطربان خوش گلو
بربط و نے سے مسخر سارا عالم ہے یہاں
ہیں عجب میٹھے سروں میں بج رہی شہنائیاں
شیریں ہوتے ہیں سنے نغمے پہ شیریں تر کہیں
اَن سنے نغمے ہیں یہ جن کی صدا کوئی نہیں
جھوم جھوم اٹھتا ہے دل اس ساز بے آواز پر
حیراں موسیقی ہے نقاشی کے اس اعجاز پر

اے جواں ! تو کتنا خوش قسمت ہے، محبوبہ تری
ہار پھولوں کا لئے ہے سامنے تیرے کھڑی
تو جدا ہوگا نہ اس سے اور نہ وہ تجھ سے کبھی
اور نہ کمہلا ئے گی ان پھولوں کی کوئی پنکھڑی
وہ سدا چاہے گی تجھ کو اور اسے چاہے گا تو
آہ پھر بھی بر نہ آئے گی دلوں کی آرزو
کھیل تو سکتا نہیں ان کاکل و رخسار سے
ڈال وہ سکتی بانہیں گلے میں پیار سے

یہ چراگہہ، گویا ایک خود رو چمن آزاد رو
برگ و گل جس کے کبھی ہوں گے نہ پامال خزاں
نے نواز اے گلہ باں، تازہ بہ تازہ نو بہ نو
تیری ہر لے میں ہے گم اک طرفہ رنگیں داستاں
ہاں وہ رنگیں داستاں سرمایۂ شعروادب
جس کے پس منظر میں یونانی شبانی روز وشب
حسن سادہ، عشق سادہ، سادہ معمول حیات
بات میں اک بات، حل جس میں رموز کائنات
یہ چراگہہ آج صدیوں بعد بھی اے گلہ باں
ہے اسی رومانیت کے ساتھ رنگین و جواں

کونسا دریا کنارے شہر یہ آباد ہے
یہ فصیل و برج، یہ مینار و گنبد شاندار

شہر کے باہر مگر ہیں جمع سب اہل دیار
کوچہ و بازار ویراں ہیں یہ کیا افتاد ہے؟
خوبصورت شہر! اپنے شہریوں کے باوجود
تو رہے گا یونہی غیر آباد اور ان کا ورود
اب کبھی ان تیرے ایوانوں میں ہوسکتا نہیں
اب نہ ہرگز ہوں گے واپس ان مکانوں کے مکیں

اے اتھینی فیلسوف' اے دخت یونان قدیم
تیرا ہر انداز ہے اک دعوت ذوق سلیم
یہ مناظر دلنشین یہ فکر و فن وجد آفریں
کس دیانت سے روایات کہن کے ہیں امیں
ہیں تری تخلیق میں حسن و صداقت ساتھ ساتھ
تجھ میں ہے مضمر جمالیات کی اجمالیات
فکر وفن کو دے رہی اپنا جو یہ پیغام ہے
حسن ہے صدق اور صدق اک حسن ہی کا نام ہے

لارڈ الفرڈ ٹینی سن

LORD ALFRED TENNYSON

(1809-92)

عہد وکٹوریہ کا یہ عظیم شاعر لنکن شائر کے قصبے سومرزبائی کے علم دوست گھرانے میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کا باپ ایک مذہبی تعلیمی ادارے کا سربراہ تھا۔ اور جو خود بھی ایک شاعر تھا۔ اس کے دو بھائی فریڈک اور چارلس بھی اچھے شاعر تھے۔ اس گھریلو پس منظر سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ الفرڈ ٹینی سن نے ایک علمی اور ادبی فضا میں آنکھ کھولی اور اسی ماحول میں پرورش پائی۔ صرف آٹھ برس کے سن سے اس نے شعر کہنا شروع کیا اس کا معمول تھا کہ وہ جس شاعر کا مطالعہ کرتا اسی کے رنگ میں خود بھی شعر موزوں کرنے لگتا۔ چنانچہ اس کی ابتدائی نظموں میں اسکاٹ (Scot) مور (Moore) اور بائرن (Byron) کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کو بائرن سے بے پناہ عقیدت تھی۔ بائرن کی موت کی خبر پندرہ سالہ ٹینی سن کو بے حد شاق گزری۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کیمرج گیا۔ جہاں اس کا بھائی چارلس پہلے سے موجود تھا۔ کیمبرج کی علمی اور ادبی فضا نے اس کی صلاحیتوں کو اور بھی جلا بخشی۔ اسی سال الفرڈ اور چارلس کا یکجائی شعری مجموعہ (Poems by Two Brothers) شائع ہوا۔ ۱۸۲۹ء میں اس کی ایک نظم پر اسے سونے کا تمغہ ملا۔ ۱۸۳۰ء میں اس کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا لیکن کوئی خاص مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۸۳۱ء میں

اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور اسے مجبوراً ترک تعلیم کرکے اپنے آبائی گاؤں سومرزبائی واپس ہونا پڑا۔ ۱۸۳۳ء میں اس نے اپنا ایک اور مجموعہ کلام شائع کیا جسے نقادوں نے آڑے ہاتھوں لیا اور اس کی شاعری پر کڑی تنقید کی جس کے نتیجہ میں ایک مدت دراز تک اسے اپنا کوئی دوسرا مجموعہ شائع کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے اپنے دو مجموعے بیک وقت شائع کئے جو اس عہد کے برطانوی وزیراعظم سر رابرٹ پیل (Sir Robert Peele) کو بہت پسند آئے اور الفرڈ ٹینی سن کی دو سو پونڈ سالانہ پنشن مقرر کردی گئی۔ اس قدر دانی نے طبع شاعر کو تیز تر کردیا۔ اس کے کلام میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ بڑی دلکشی اور دل آویزی ہے خود ملکہ وکٹوریہ اس کی بڑی مداح تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء میں ورڈزورتھ کے مرجانے پر الفرڈ ٹینی سن کو ملک الشعراء انگلستان کا اعزاز عطا ہوا۔ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اس نے کئی معرکہ آرا نظمیں لکھیں جو بیحد مقبول ہوئیں اور اسے انگلستان کا قومی شاعر کہا جانے لگا۔ اسے انگریزی زبان پر بلا کی قدرت حاصل تھی۔ اور اپنی زباندانی پر اس کو بڑا ناز تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ انگریزی زبان کے ایک ایک لفظ کے معنی و مزاج سے جس قدر وہ خود باخبر ہے شیکسپئر کے علاوہ دوسرا کوئی انگریز شاعر اس معیار و منزلت پر اس کو نظر نہیں آتا۔

الفریڈ ٹینی سن ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ایک ہے جسے خود اس کے زمانے میں بہت سراہا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۴ء میں اسے لارڈ کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں تراسی ۸۳ سال کی عمر پاکر اس نے انتقال کیا۔

ذیل میں ٹینی سن کی مشہور نظم 'Come into the Garden, Maud' کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جسے شاعر ہی کی رام اسکیم میں منظوم کیا گیا ہے۔

ترجمہ

آ عندلیب باغ میں

آ عندلیب باغ میں، آ میری عندلیب!
رخصت ہوئی شب، اڑ گیا وہ شپرک سیاہ
آنے کو عندلیب ہے میری خوشا نصیب
صحن چمن کئے ہیں دل و دیدہ فرش راہ
ہے اک عجب بہار ہے اک موسم عجیب
آ میرے صحن باغ میں، اے رشک مہر و ماہ

ہیں جابجا کھلے ہوئے نسرین و یاسمن
ہیں مشک سے مہکتے ہوئے ہر طرف گلاب
رقاصۂ فلک بصد آداب انجمن
مجرے کے بعد ڈال رہی رخ پہ ہی نقاب
ہونے لگی درست وہ بستر کی ہر شکن
تاروں کی سیج پر ہے وہ ہونے کو محو خواب

ہے رقص گاہ میں وہاں ساز رباب و چنگ
دیتا ہوا وہ دعوت رقص اس کا زیروبم
رقصاں ہر ایک سمت حسینان شوخ وشنگ
ہر قص کے قدم سے ملاتی ہوئی قدم
حلقے کمر کے گرد ہوئے جارہے ہیں تنگ
راز و نیاز اور کہیں سرگوشیاں بہم

ہیں ساری رات سنبل وریحاں سنا کیے
وہ ارغنون رقص وہ افسون ساز عشق
زندہ دلان بزم چمن سر دھنا کیے
سن کر پیام شوق وہ عرض و نیاز عشق
سرو وسمن کھڑے رہے ہاتھوں کو وا کیے
پوشیدہ تھا کسی کا کسی سے نہ راز عشق

میں نے کہا کلی سے کہ اے نوبہار ناز
اس بزم میں ہے تجھ سے بھی نازک سی اک کلی
تیری طرح سے وہ بھی ہے اک حسن پاکباز
تیری طرح سے نور کے سانچے میں ہے ڈھلی
رقص و سرود ختم ہوا، تھم گیا ہے ساز
چلنے کو ہے اب اس کی سواری، بس اب چلی

گل سے کہا یہ میں نے کہ اے مائیہ چمن
سچ سچ بتا' ہوں پوچھتا تجھ سے میں ایک بات
تو کس کا مبتلا ہے' تجھے کس کی ہے لگن
گریاں رہا ہے کس کے لئے تو تمام رات
کیا بھاگئی ہے تجھ کو بھی اس شوخ کی پھبن
لیکن وہ صرف میری ہے میری وہ کائنات

ہے اس کا انتظار اسی کا ہے انتظار
جس کے لئے ٹھہر گئی بہتی یہ جوئے آب
ہے جس کے شوق دید میں ہر موج بیقرار
آنکھیں بچھائے دیتے ہیں جس کے لئے حباب
گلشن میں جس کو دیکھنے آئی ہے خود بہار
کلیاں مچل رہی ہیں گلوں کو ہے اضطراب

اٹھ اٹھ کے سطح آب سے وہ جھانکتے کنول
نرگس وہ اس کی آنکھوں کی کھاتی ہوئی قسم
سوسن زبان شعر سے کہتی ہوئی غزل
سنبل سنوارتی ہوئی زلفوں کے پیچ وخم
ارماں ہر ایک دل میں رہے ہیں یہاں مچل
سبزے کو اشتیاق کہ میں چوم لوں قدم

سرگوشیاں گلوں میں ہوئیں "آرہی ہے وہ!"
وہ آرہی ہے اس کی سواری خوشا نصیب
پھولوں پہ پھول ناز سے برسا رہی ہے وہ
آئی چمن میں بادبہاری خوشا نصیب
تکلیف میرے واسطے فرما رہی ہے وہ
لب پر ہے سرخوشی کے یہ جاری خوشا نصیب

ہر شاخ گل ہے کہہ رہی جھک کر "خوش آمدید"
وہ درمیاں گلوں کے شہ گل بہ اہتمام
ہر ہر ادائے ناز یہ دیتی ہوئی نوید!
ہر ہر نگاہ لطف یہ دیتی ہوئی پیام
صد مرحبا وہ چرخ پہ چمکا ہلال عید
یا آگیا اتر کے زمیں پر مہ تمام

ٹینی سن کی ایک اور نظم (Crossing the Bar) کا منظوم ترجمہ "حوالے ناخدا کے ناؤ" کے عنوان سے ہدیہ ناظرین ہے۔ شاعر کی یہ آخری تخلیق تھی جس کے متعلق اس کی ہدایت تھی کہ اس کے مجموعہ کلام میں اسے سب سے آخر میں جگہ دی جائے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ انگریزی زبان میں لفظ "Bar" کے بہت سے معنی ہیں یہاں یہ لفظ بندرگاہ کے آخری حدود کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

حوالے ناخدا کے ناؤ

لب ساحل افق پر جھلملاتا شام کا تارا
اور اک آواز کوئی دور سے مجھ کو بلاتی ہے
عزیزو ، الوداع ! ہے کوچ کا بجنے کو نقارہ
حوالے ناخدا کے ناؤ ہے ، سنگی نہ ساتھی ہے

ہے مدوجزر محو خواب اور ساکت ہے سطح آب
ادھر گہرائیوں میں لے رہے طوفاں ہیں انگڑائی
مگر ممکن نہیں اٹھ کر کوئی طوفاں کوئی گرداب
بدل دے سمت میری ناؤ کی ان کی توانائی

چلی ہے ناؤ اک انجانے ساحل کی طرف میری
جہاں سے پھر مسافر لوٹ کر واپس نہیں آتا
نہیں ہوتی ہے جس کی سرزمیں کی سیر سے سیری
کہ جو جاتا یہاں سے ہے وہیں کا ہوکے رہ جاتا

ہے میری ناؤ آپہنچی زمیں سے اور زماں سے دور
جہاں میں ناخدا کو دیکھ سکتا ہوں نظر بھر کے
جو رحمت اور محبت ہے سراسر اور سراپا نور
ہیں یہ ارض و سما پرتو اسی عکس منور کے

رابرٹ براؤننگ

ROBERT BROWNING

(1812-89)

رابرٹ براؤننگ کو عہد وکٹوریہ کے شعراء میں ٹینی سن کا ہم پلہ مانا جاتا ہے۔ وہ لندن کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ خود بھی ایک ذی حیثیت شخص تھا جس کے پاس اس کی ذاتی نہایت عمدہ لائبریری تھی اس نے بچپن ہی سے ہونہار براؤننگ میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کردیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو خود تعلیم دیتا اور بہت کم عمری میں اس نے براؤننگ میں لاطینی اور یونانی درسیات کی خاصی استعداد پیدا کردی۔ ۱۸۲۹ء میں براؤننگ نے لندن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اور فلسفہ اور ادب میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۳۴ء میں اس نے روس کا دورہ کیا۔ چند سال بعد اٹلی گیا اور وہاں کافی عرصہ گزارا۔ ۱۸۳۲-۴۴ء کے دوران اس نے بہت سی نظمیں اور ڈرامے لکھے۔ ۱۸۴۶ء میں اس نے اپنے دور کی مشہور شاعرہ الزبتھ بیرٹ (Elzabeth Barret) سے شادی کی جو بعد میں مسز براؤننگ (Mrs. E. B. Browning) کے نام سے مشہور ہوئی۔

شادی کے بعد دونوں اٹلی کے شہر فلورنس میں آباد ہوگئے اور صرف چھٹیاں منانے کے لئے کبھی کبھی انگلستان یا فرانس چلے جاتے۔ ۱۸۶۱ء میں اس کی بیوی

نے انتقال کیا بیوی کے مرنے کا اسے سخت صدمہ ہوا اور وہ اپنے کمسن اکلوتے لڑکے کو لے کر واپس انگلستان چلا آیا۔ وطن آکر سب سے پہلے اس نے اپنی آنجہانی بیوی کا کلام جمع کیا اور حسن و اہتمام سے شائع کرایا۔ اسی دوران میں اس کے بعض شعری مجموعوں اور ڈراموں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے جن سے اس کی شہرت اور مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے چونکہ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتا۔ لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں اس کا منفرد مقام تھا۔ وہ اکثر سیرِ و تفریح کی خاطر فرانس' سوئزرلینڈ' اٹلی وغیرہ جایا کرتا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں وینس کے ایک ایسے ہی تفریحی دورے میں اچانک سخت بیمار پڑا اور مرگیا۔ اس کی نعش کو برطانیہ لایا گیا جہاں ویسٹ منسٹر ایبے میں اس کو قومی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

ذیل میں براؤننگ کی مشہور نظم 'Prospice' کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نظم در حقیقت اس کی رفیقہ حیات کا مرثیہ ہے جس نے خود اسی کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ اس نظم کا شمار اس کی شاہکار نظموں میں ہوتا ہے۔ ترجمہ اصل نظم کی رائم اسکیم میں منظوم کیا گیا ہے۔ ذرا اس مرثیہ کے تیور ملاحظہ فرمائیے۔

ترجمہ

ڈر اور موت کا؟

ڈر اور موت کا ؟ ہاں، گھٹ رہا ہو حلق میں دم
بدن وہ برف، وہ آنکھوں میں گھپ اندھیری رات
عرق میں تر وہ نبرد آزما وجود و عدم
وہ پھڑپھڑاتی ہوئی روح زیرِ دام حیات

وہ تیرگی، وہ تلاطم، وہ یورش و یلغار
وہ مورچہ، ہے عدوگھات میں جہاں پہ کھڑا
عدو وہ، خوف کو خوف آئے دیکھ کر اک بار
مگر جری کا قدم اب پلٹ نہیں سکتا

کہ اب ہے ختم سفر، ہوچکی ہے منزل سر
وہ قید و بند سلاسل گئے ہیں ٹوٹ تمام
بس ایک معرکہ، اور پھر وہ تاج فتح و ظفر
دلی مراد، وہ اس رزمگاہ کا انعام

میں ایک مرد مجاہد رہا ہوں، بس اک اور
جہاد آخری و واقعی ہے مجھ کو پیش
خلاف وضع ہیں میری وہ بزدلی کے طور
سپرد خنجر کیں کردوں خود کو صورت میش؟

نہیں، وہ ذائقہ پوری طرح سے چکھنا ہے
یہی ہے عزم اولعزم ہرچہ بادا باد!
حساب عمر بس اک آن میں چکانا ہے
قبول ہے بخوشی آئے سر پہ جو افتاد؟

ہے بدترین، بہادر کو بہترین کبھی
یہ غل مچاتے شیاطیں یہ سائے پراسرار
یہ لمحے سخت و سیہ، یہ مہیب تاریکی
بس ایک آن میں ہونے کو نار ہے گلزار

وہ پو پھٹی، وہ کرن پھوٹی، لو سویرا ہوا
وہ دم میں مل گیا ہر درد کا مجھے درماں
اے میری روح کی روح! آہ تجھ کو پا ہی لیا
اب آگے جانوں میں اور میرا خالق یزداں

یہ صفحات ابھی زیر ترتیب تھے کہ براؤننگ کی ایک اور چھوٹی سی نظم کا ترجمہ ہو گیا۔ وہ بھی ہدیہ ناظرین ہے۔

خیر و عافیت

(آزاد ترجمہ رابرٹ براؤننگ)

جدھر دیکھئے حسیں نظارے
یہ دشت و دریا یہ چاند تارے

بہار پھولوں کی ہر طرف ہے
گہر بہ داماں ہر اک صدف ہے

مہک رہے ہیں شگوفہ و گل
چہک رہی ہے خوشی سے بلبل

غرض دلاویز ہر جہت ہے
یہ لب پہ شاعر کے تہنیت ہے

خدا ہے عرش بریں پہ اپنے
زمیں پہ سب خیر و عافیت ہے

MATTHEW ARNOLD

(1822-88)

میتھیو آرنلڈ

عہد وکٹوریہ کے شعراء میں میتھیو آرنلڈ کو نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ وہ نہ صرف ایک عظیم شاعر بلکہ ایک صاحب نظر نقاد بھی تھا۔ جس نے اپنے دور کے مذہبی، سماجی اور تعلیمی مسائل پر سیر حاصل تعمیری تنقیدیں کیں جو آج بھی انگریزی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

میتھیو آرنلڈ نے تدریسی و تعلیمی ماحول میں آنکھ کھولی۔ اس کا باپ ڈاکٹر تھامس آرنلڈ انگلستان کے مشہور و معروف رگبی اسکول (Rugby School) کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اسی اسکول سے ابتدائی و ثانوی تعلیم حاصل کر کے 1814ء میں وہ آکسفورڈ میں داخل ہوا۔ آکسفورڈ کی علمی و ادبی فضا میں اس کی صلاحیتوں کو اور بھی جلا ہوئی۔ 1844ء میں اس نے امتیازی کامیابی کے ساتھ آکسفورڈ سے ڈگری حاصل کی۔ پھر کچھ عرصے تک اپنے عہد کے مشہور سیاستداں لارڈ لینسڈون (Lord Landsdowne) کے پرائیویٹ سیکریٹری کے طور پر خدمات انجام دیں۔ 1851ء میں اسے انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے کی پیش کش ہوئی جو

اس نے قبول کر لی اور ایک مدت دراز تک اسی منصب پر فائز رہا۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں اسے عموماً دورہ پر رہنا پڑتا' ان دوروں کی لمبی چوڑی رپورٹیں تیار کرنی ہوتیں ہر قسم کے موسم میں سفر اور ہر طرح کے ہوٹلوں میں مقیم ہونا پڑتا۔ مگر تعلیم و تدریس سے اس کا گہرا لگاؤ اور غیر معمولی دلچسپی ان تمام دقتوں اور دشواریوں کو خاطر میں نہ لاتی۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے اسے کئی بار فرانس' جرمنی اور سوئزرلینڈ بھیجا گیا۔ اس نے اپنے ملک کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے' ایک شاعر کی حیثیت سے میتھیو آرنلڈ کا مقام انگریزی شعروادب میں نہایت بلند ہے۔ اس کا پہلا مجموعہ کلام (Poems by A) 1847ء میں شائع ہوا۔ 1852ء میں اس کا دوسرا مجموعہ بھی اسی مخفف نام سے شائع ہوا۔ یہ دونوں مجموعے انگلستان کے باذوق حلقوں میں بے حد پسند کئے گئے۔ 1852ء میں پہلی بار اس کا شعری مجموعہ اس کے پورے نام سے شائع ہوا۔ 1857ء میں آکسفورڈ میں انگریزی کی کرسی کے لئے اسے منتخب کیا گیا۔ جس پر وہ دس سال تک فائز رہا۔ اسی سال اس کی معرکہ آرا نظم "سہراب اینڈ رستم" شائع ہوئی جو بے حد مقبول ہوئی۔ ذیل میں میتھیو آرنلڈ کی شاہکار نظم ڈوور بیچ Dover Beach کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جسے انگریزی شاعری میں ایک سنگ میل کا درجہ دیا جاتا ہے۔

ترجمہ

ساحل ڈوور

ساحل ڈوور، شب مہتاب اور یہ جزر و مد
جا بجا روشن منارے ایستادہ سروقد
دور تک پھیلی ہوئی وہ جگمگاتی رودبار
بر و بحر اک طرفہ رومانی ادا سے ہمکنار
نور کا ساغر ہے اک، یا چرخ پر ماہ تمام
پیر گردوں کر رہا ہے یا کوئی تجویز جام
وہ افق پر جھلملاتی روشنی
فرانس کے ساحل پہ زریں گوٹ سی اک دیدہ زیب
ہے نظر آتی تو چھپ جاتی کبھی
ٹوٹ جاتا ہے وہ رہ رہ کر طلسم دلفریب

ہم نشیں!
آ اس دریچے کے قریں
کیا سہانا ہے سماں اور رات ہے کتنی حسیں!
ہاں سنو تو، کہہ رہا ہے کیا سمندر کا یہ شور
سنگریزوں کی صدائیں اور وہ موجوں کی پکار
قوتیں ٹکرا رہی ہیں، آزماتی اپنا زور
جھنجھنا اٹھتے ہیں جس سے بربط شاعر کے تار
وہ چلی آتی ہے بپھری موج ساحل کی طرف
غیظ و غصے میں اڑاتی جھاگ، جاری منہ سے کف
آ کے ساحل سے مگر ٹکرا کے سر لیتی ہے پھوڑ
اور دم دیتی ہے توڑ
جانے کس ساحل کی تھی اس کو تلاش
اور کہاں ٹکرا کے آخر ہوگئی وہ پاش پاش
سعی و ناکامی پہ اپنی نوحہ خواں
کر رہی ہیں موجیں فریاد و فغاں

مدتوں پہلے اسی ساز شکستہ کی فغاں
ساحل یوناں پہ شاعر نے سنی تھی ناگہاں
درد میں ڈوبی وہ دھن جس کو دیئے شاعر نے بول
اور دی تھیں اس میں گھول
زندگی کی تلخیاں، دکھ درد کی آلائشیں
اس دکھی انساں کی سعی بے سبب اور کاوشیں

پیش قدمی، واپسی، پھر پیش قدمی، واپسی
ہے یہی مسقوم ان موجوں کا، اپنا بھی یہی
ہے یہاں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی
بس یونہی اٹھتی رہے گی موج کے بعد ایک موج
جس طرح اس رن سے گزری فوج کے بعد ایک فوج

دین و مذہب کا سمندر بھی اسی صورت کبھی
کرہ ہستی پہ ٹھاٹھیں مارتا تھا چار سو
اور یہ سارا جہان رنگ و بو
اس کی جولاں گاہ تھی
لیکن اب یہ گھن گرج اس کی یہ چنگھاڑ اور دھاڑ
ہے فقط ڈھلتے ہوئے طوفاں کی فریاد و فغاں
ہیں اترتی جا رہی یہ موجیں کھا کھا کر پچھاڑ
جھک رہا ہے اب زمیں کے آگے اونچا آسماں

میرے پیارے دوست، ہم دونوں کو ہے جس کی تلاش
آہ! وہ جنس وفا مل جائے ہم دونوں کو کاش
کیونکہ یہ دنیا نظر آتی ہے جو اتنی حسیں
ایسی رنگا رنگ، ایسی دلفریب و دلنشیں
در حقیقت محض اک دھوکہ ہے اور کچھ بھی نہیں
ہم حقیقی شادمانی سے یہاں بیگانہ ہیں
گریاں مثل شمع، سوزاں صورت پروانہ ہیں

ہے یہاں تسکین خاطر اور نہ ہے نور و سرور
ہم بہم مل بیٹھتے ہیں پر دلوں سے دور دور
اس اندھیرے بن میں ہم گم کردہ منزل بدحواس
ہیں بھٹکتے پھر رہے' طاری ہے اک خوف و ہراس
معرکہ آرائے شب خوں ہے بہم انجان فوج
جس طرح ٹکرا رہی ہے موج سے ہر ایک موج

بعض شعرائے مغرب جب کسی قدرتی منظر کی تصویر اپنے الفاظ میں کھینچتے ہیں تو اس منظر کے صوتی آہنگ میں شعر موزوں کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میتھیو آرنلڈ کی اس نظم میں بھی یہی صوتی التزام ہے۔ اصل نظم کے الفاظ ادا کرتے ہوئے سمندری لہروں کے ساحل پر ٹکرانے اور واپس لوٹ جانے کی آواز صاف سنائی دینے لگتی ہے۔ مگر آرنلڈ نے اس کا کریڈٹ قدیم یونانی شاعر سوفوکلیز (Sophocles) کو دیا ہے جس کی کسی قدیم نظم سے خود آرنلڈ نے استفادہ کیا ہے اور اپنی اس نظم میں اس کا نام لے کر اسے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس مصرعے میں لفظ "شاعر" سے مراد سوفوکلیز ہے۔

COVENTRY PATMORE
(1828-1896)

کوونٹری پیٹ مور

کووینٹری پیٹ مور ایک سادہ طبیعت انسان تھا جس کی عمر برٹش میوزیم لائبریری لندن میں ایک ذمہ دار عہدے پر ملازمت کرتے گزری۔ اپنے عہد کے اچھے لکھنے والوں میں اس کا شمار تھا۔ وہ نہ صرف ایک شاعر بلکہ ایک اچھا ادیب بھی تھا جس کے مضامین اس زمانے کے معیاری رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوا کرتے اور ادبی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مقالے اور مضامین کے علاوہ اس نے بہت سی ناولیں لکھیں اور کئی شعری مجموعے یادگار چھوڑے۔ اس کی تمام تخلیقات میں اخلاقی اور مذہبی عنصر خاص طور پر نمایاں ہے۔

ذیل میں پیٹ مور کی مشہور نظم Toys کا ترجمہ اصل نظم کے مشابہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کھلونے

سات سالہ مرا فرزند مرا لختِ جگر
طفل وہ بے مادر
لیکن اس نے مری تنبیہہ کے باوصف پھر آج
ساتویں مرتبہ عمداً" مرا توڑا قانون
کھولنے ہی تو لگا میرا خون
تھا مرے پاس نہ کچھ اس کے سوا کوئی علاج
سخت لہجے میں بری طرح سے اس کو ڈانٹا
اور اک منہ پر لگایا چانٹا

اور اس رات خلافِ معمول
دمِ رخصت نہ دعا دی' نہ اسے پیار کیا
گرچہ تھا سامنے میرے وہ کھڑا

اپنی آنکھوں میں بھرے موتی مرا درِ یتیم
جیسے ڈوبے ہوئے شبنم میں ہوں نرگس کے دو پھول
صاحب وضع میں پابند اصول
کر سکا اپنے رویے میں نہ کوئی ترمیم
مڑے ہم خواب گہوں کی طرف اپنی اپنی
اور کوئی بات نہ کی

-

کروٹیں بدلا کیا، نیند نہ آئی مجھ کو
آخرش جی میں مرے آئی ذرا دیکھوں تو
کہ ہے کس حال میں میرادلبند
جھانک کر دیکھا جو میں نے اندر
سو رہا تھا وہ مرا نور نظر
ایک خوابیدہ کلی کی مانند
ننھے رخساروں پر ڈھلکے ہوئے آنسو تھے جمے
پاس اک میز پہ کچھ اس کے کھلونے تھے سجے
سیپیاں، گھونگے، پرانے سکے
چند سنگ خارا
ایک ٹوٹا سا قلم
بڑی فنکاری سے ان سب کو سجایا تھا گیا
بھول جانے کے لئے اپنا غم
دیکھ کر اس کو مجھے آگیا بیساختہ پیار
اس کے اشکوں پہ مرے اشک لگے ہونے نثار

اٹھ گئے بارگہ حق میں مرے دست دعا
دل پگھل کر مرا آنکھوں سے مری بہنے لگا
گڑگڑا کر یہ کہا میں نے کہ اے رب رحیم
میں بھی اک طفلک ناداں ہوں؟ خداوند کریم
کھیلتا میں بھی کھلونوں سے ہوں اکثر یا رب
بخش دے کھیل یہ بچوں کا سمجھ کر یا رب
روز محشر کوئی طفلانہ ادا بھا جائے
رحم شاید مری نادانیوں پر آجائے

DANTE GABRIEL ROSSETTI

(1828 - 82)

دانتے گیبرئیل روزیٹی

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دانتے گیبرئیل روزیٹی اطالوی نژاد تھا اس کا باپ گیبرئیل روزیٹی (GABRIEL ROSSETTI) 1821ء میں اپنے وطن اٹلی سے ایک سیاسی پناہ گزین کی حیثیت سے وارد انگلستان ہوا تھا اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آدمی صاحب علم تھا۔ کنگز کالج لندن میں اسے اطالوی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔ لندن میں مقیم ایک اور اطالوی خاندان کی لڑکی سے اس نے شادی کر لی جس کی ماں انگریز تھی۔ اس طرح ان کے گھریلو ماحول میں اطالوی زبان کے ساتھ ساتھ شستہ اور معیاری انگریزی بلا تکلف اور روانی سے بولی جاتی تھی۔ پروفیسر روزیٹی کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ یہ سب کے سب نہایت ذہین اور صاحب ذوق تھے۔ دانتے گیبرئیل روزیٹی نے کنگز کالج لندن میں تعلیم پائی جہاں اس کا باپ پروفیسر تھا۔ اسی دوران میں اسے مصوری کا شوق ہوا اور واٹر کلر پینٹنگ میں مہارت حاصل کی۔ پھر رائل اکیڈمی لندن میں فن مصوری کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ شیکسپیئر، گوئٹے اور بائرن اس کے پسندیدہ شاعر

تھے۔ پھر مشہور برطانوی مصور شاعر ولیم بلیک کی روایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے بھی مصوری اور شاعری دونوں کو اپنے ذوق جمالیات کی تسکین و اظہار کا ذریعہ بنایا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے طبع زاد نظموں کے علاوہ کئی اطالوی شعراء کا کلام انگریزی میں منتقل کیا۔ اس دور کے کئی نوجوان ابھرتے ہوئے مصور جو 'مصوری میں حقیقت' کے قائل تھے اس کے گرد جمع ہوگئے۔ ان میں اس کا دوست اور ہمعصر شاعر ولیم مورس William Morris بھی تھا۔ ان نوجوان فنکاروں نے "پری ریفیلا ئٹس" The Pre-Raphaelites کے نام سے اپنے حلقے کو متعارف کرایا۔ انہیں اس دور کے مشہور نقاد فن جان رسکن (John Ruskin) کی ایک عرصے تک حمایت حاصل رہی۔ 'آکسفورڈ اور کیمبرج میں ان کی تخلیقات کو بے حد پسند کیا گیا۔ اتفاقا ایک حسین و جمیل لڑکی الزبتھ سڈن بھی ان کے حلقے میں شامل ہوئی جو ابتداء میں ان مصوروں کے لئے ماڈل کی خدمات انجام دیتی رہی لیکن کچھ دنوں بعد اس نے دانتے گیبرئیل روزیٹی سے شادی کرلی۔ اسی اثناء میں شیکسپئر کے بعض مداحوں نے ان نوجوان مصوروں سے درخواست کی کہ وہ شیکسپیئر کے ڈراموں کے چیدہ چیدہ سین اپنے فن کے ذریعے پیش کریں چنانچہ انہوں نے ایسی کئی خوبصورت تخلیقات پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔ جن میں مسز روزیٹی ہی اکثر و بیشتر ماڈل تھی۔ اس حلقے کے ایک مشہور مصور ہولمین ہنٹ (Holman Hunt) کو شیکسپئر کے شاہکار ہملٹ کے ایک منظر (Death of Ophelia) میں رنگ بھرنے کا خیال آیا' اور اس نے اپنی اس تخلیق کے لئے مسز روزیٹی سے ماڈل بننے کی درخواست کی جو اس نے قبول کرلی اور اس کے شوہر کو بھی اس پر کوئی

اعتراض نہ ہوا۔ اوفیلیا کی موت پانی میں ڈوب کر ہوئی تھی اور مصور اوفیلیا کو اسی طرح پانی میں ڈوبا ہوا اپنی تخلیق میں دکھانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک بڑے ٹب کا انتظام کیا جس میں پانی بھر کر اس کے نیچے آگ روشن کر دی جاتی تاکہ پانی گرم ہوجائے اور ماڈل کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مسز روزیٹی اوفیلیا کے بہروپ میں اس پانی میں لیٹ کر مصور کی ہدایات کے مطابق اپنا پوز ادا کرتی اور مصور تصویر کشی میں مشغول ہوجاتا۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا اور مصور اور ماڈل دونوں اس کے عادی ہوچکے تھے۔ مگر شدنی ہو کر رہتی ہے۔ ایک بار مصور ٹب کے نیچے آگ جلانا بھول گیا۔ بعض کہتے ہیں اس نے آگ جلائی تو تھی مگر کسی وجہ سے بجھ گئی اور مصور کو اس کا پتہ نہ چلا اور اس طرح اوفیلیا کی موت خود ماڈل کی موت بن گئی۔ مسز روزیٹی اوفیلیا بنی ہوئی آئی اور آتے ہی حسب معمول اس پانی میں بلا جھجھک لیٹ گئی۔ جاڑے کا موسم' انگلینڈ کی یخ بستہ سردی' نقطہ انجماد کے نزدیک پانی' غریب کو نمونیہ ہوا اور مر گئی۔

روزیٹی کو اپنی محبوب بیوی کی موت بہت ہی شاق گذری۔ اس نے اس وقت تک جتنی نظمیں لکھی تھیں' یہ کہہ کر اپنی بیوی کے تابوت کے ساتھ دفن کر دیں کہ یہ سب اسی کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اس کے غم میں اس نے شعر کہنا بھی چھوڑ دیا۔ وقت بہر حال ہر غم کا مداوا کر دیتا ہے۔ روزیٹی بھی اپنے غم کا مداوا کرنے کے لئے دوبارہ فنون کی دنیا میں لوٹ آیا۔ شاعری اور مصوری دونوں سے اس کو یکساں طور پر عشق تھا اور ان دونوں میدانوں میں غیر فانی تخلیقات یادگار چھوڑیں۔ اس شعری مجموعے کے علاوہ جو اس کی بیوی کے تابوت میں دفن تھا۔ اس کے کئی مجموعے

شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ بیوی کے انتقال کے عرصہ دراز کے بعد اپنے مداحوں کے بے حد اصرار پر اس نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ قبر کھود کر اس کا دفن شدہ مجموعہ کلام بھی نکال کر شائع کرا دیں

ذیل میں دانتے گیبرئیل روزیٹی کے مشہور سانٹ Love Sight کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو اس نے اپنی محبوب بیوی کی موت پر اس کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر لکھا تھا۔

ترجمہ

اے جانِ جاں

دیکھتا ہوں جب تری تصویر کو اے جانِ جاں
چشمِ تر تیری پرستش کے لئے بے اختیار
دیپ اشکوں کے جلا کر تجھ پہ ہوتی ہے نثار
اور مرے سجدوں کو مل جاتا ہے تیرا آستاں

ختم ہوجاتے وہ سارے فاصلے ہیں درمیاں
یوں لب و رخسار میں اک بار کھو جاتا ہوں میں
اور گھنیری چھاؤں میں زلفوں کی سو جاتا ہوں میں
کھو کے خود، اے دوست، پا جاتا ہوں میں تیرا نشاں

آہ! اب یہ دل ربا صورت نہ آئے گی نظر
اور یہ شوخ آنکھیں رہیں گی اب ہمیشہ محوِ خواب
ہو نہیں سکتی ہے ان کانوں کو اب کوئی خبر
جز خموشی یہ لبِ شیریں نہ کچھ دیں گے جواب

زندگی پر موت کی پیہم ستم آرئیاں
سنگدل کتنی ہیں پُر اسرار وہ پرچھائیاں

SWINBURNE (1837 - 1909)

ایلجرنن چارلس سوئن برن

یوں تو اس مختصر کتاب میں بہت سے اہم انگریزی شعراء چھوٹ گئے ہیں لیکن سوئن برن کی کمی ذاتی طور پر محسوس کرتے ہوئے میں نے عہد وکٹوریہ کے اس ممتاز شاعر کی ایک نظم کو ترجمہ کر کے اسے بھی ان اوراق میں شامل کر لیا ہے۔ بائرن کی طرح سوئن برن کا تعلق بھی طبقہ امراء سے تھا۔ اس کا باپ برطانوی بحریہ کا امیر البحر اور ماں لارڈ ایش برنہم Lord Ashburnham کی بیٹی تھی۔ وہ اپنی موروثی جاگیر نارتھمبر لینڈ Northumberland میں پیدا ہوا۔ بچپن اسی جاگیر اور لندن میں گذرا۔ ابتدائی تعلیم ایٹن Eton میں پائی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ آیا جہاں اس کی ملاقات مصور شعراء روزیٹی اور مورس سے ہوئی اور وہیں سے اس کی شعری اور ادبی تخلیقات کا آغاز ہوا۔ 1861ء میں اس کے دو ڈرامے منظر عام پر آئے مگر ان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ 66-1865 میں اس کے دو شعری مجموعوں نے ہر ایک کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ آزاد خیال حلقوں میں انہیں بے حد سراہا گیا جب کہ دوسری جانب اس کے باغیانہ انداز فکر کو سخت ناپسند کیا گیا اور اس پر کڑی تنقید کی گئی۔ انگلستان کے مشہور جریدہ "پنچ" The Punch نے اسے Mr.Swinburne کی

بجائے Mr. Swine-born تک لکھ ڈالا' لیکن اس کے باوجود اس کے زور قلم میں کمی نہ آئی۔ وہ برابر لکھتا رہا کیونکہ اس کے پاس لکھنے کے سو اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ موروثی جائیداد کی معقول آمدنی کے سبب وہ فکر معاش سے قطعی آزاد تھا۔ اس کے علاوہ اس کی تخلیقات کی نشرو اشاعت کے تمام اخراجات اس کے متمول اور با اثر دوست لارڈ ہفٹن Lord Houghton کے ذمہ تھے۔ بے فکری اور آسودہ حالی نے اسے غلط راہوں پر ڈال دیا۔ کثرت مے نوشی اور عیاشی نے اس کی صحت خراب کر دی۔ 1879ء میں وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکا تھا مگر اس وقت اس کے ایک مخلص دوست' اس کے خاندانی وکیل' واٹس ڈنٹن Watts Dunton نے صحیح معنوں میں حق دوستی ادا کیا۔ وہ اس کا گارجین بن گیا اور اس نے سختی کے ساتھ اس کی ہر بے راہ روی سے اسے باز رکھا اور معالج کے عین مشورے کے مطابق بسر کرنے پر اسے مجبور کر دیا۔ یہ سلسلہ تیس سال مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ بہتر برس کی پختہ عمر کو پہنچ کر اپنی طبعی موت سے 1909ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس تیس سال کی مدت میں اس نے تیئس تصنیفات مکمل کیں جن میں نظم' نثر' ڈرامہ سبھی کچھ شامل ہے۔

سوئن برن بلاشبہ اپنے وقت کا ایک عظیم شاعر تھا جس کے کمال کے معترف اس کے معترض بھی تھے۔ یونانی کلاسیکی شاعری پر اس کی گہری نظر تھی چنانچہ وہی کلاسیکی پر وقار انداز اس کی شاعری میں رچا بسا ہوا ہے۔

سوئن برن کا نام اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ جب فزجیرالڈ Fizgerald نے رباعیات عمر خیام انگریزی میں پیش کیں تو ایک مدت تک انہیں لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا سوئبرن اور اس کے دوست روزیٹی

نے ان مشرقی جواہرات کو پرکھا اور ان کی قدر و قیمت سے اپنے ہموطنوں کو آگاہ کیا جس کے بعد سارے مغرب میں ان رباعیات کی دھوم مچ گئی۔

ذیل میں سوئن برن کی مشہور نظم The Hounds of Spring کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نظم سات اسٹینزوں پر مشتمل ہے جس میں یونانی کلاسیکی شاعری کی تلمیحات اور اصطلاحات کی بھرمار ہے جو اردو میں قطعی اجنبی ہوتیں اس لئے انہیں نظرانداز کر کے میں نے اس ترجمے کو اصل نظم کی رائم اسکیم میں صرف چار اسٹنزوں میں محدود کر دیا ہے۔ چونکہ نظم کا موضوع "آمد بہار" ہے لہذا جب میں یہ ترجمہ کر رہا تھا اس وقت اس موضوع پر عرفی، قاآنی، سودا اور محسن کاکوروی کے قصائد کی بہاریہ تشبیبوں کی ایک قوس قزح میرے شعور و لاشعور کو مسحور کر رہی تھی اور میرا مشرقی ضمیر اس شاعر مغرب کی تمام رنگ آمیزیوں اور نغمہ آفرینیوں کی داد تو ضرور دے رہا تھا مگر ان سے مرعوب ہرگز نہ تھا کیونکہ خود اس کے مشرقی ورثے میں اس سے بھی کہیں زیادہ جادوبیانیاں موجود ہیں جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

ترجمہ

آمد بہار

نکل پڑے جو سگان بہار بہر شکار
سمجھئے خیر نہیں اب ہے صید سرما کی
کی اختیار زمستاں نے بسکہ راہ فرار
نہ سر چھپانے کی تدبیر جب کہیں دیکھی
خزاں نے کوچ کیا' دھوم سے بہار آئی
کھلائے گل نئے لے کر زمیں نے انگڑائی
مہکتے دشت' لہکتے ہیں اس طرف کہسار
ہے رنگ و بو میں بھی گویا لگی ہوئی بازی

ہے آمد آمد فصل بہار، موسم گل
وہ دشت و در، وہ چراگاہیں مسکرانے لگیں
ادھر جو شاخ شجر پر ہے نغمہ خواں بلبل
تو ندیاں بھی ادھر جلترن بجانے لگیں
ہرا بھرا ہے جو جنگل، ہرے بھرے کہسار
چلے وہ من چلے گھوڑوں پہ بہر سیر و شکار
لگے وہ گونجنے بن میں شکاریوں کے بگل
صدائیں بھونکتے کتوں کی ان کے آنے لگیں

ہے رت بدل گئی، سرسبز ہیں چراگاہیں
چراگھوں میں وہ بھیڑیں چراتے گلہ بان
ہے جن کی نے میں وہ جادو کہ وہ اگر چاہیں
تو وادیوں میں اولمپس کی ٹوٹے ان کی تان
کھروں پہ دوڑتا وہ دیوتا چلا آئے
اور اپنے ساز کے سرگم وہ ان سروں سے ملائے
دکھائے فکر کو ایسی نئی نئی راہیں
کہ ہوش کے بھی اڑیں ہوش، عقل ہو حیران

بہار آئی کہ آیا ہے دخت رز پہ شباب
لگا کے تاج بلوریں نبی وہ غیرت حور
رواں ہے موج تبسم سے جس کی جوئے شراب
کہ جس کی مانگ کے جھومر ہیں خوشہ انگور

ہجوم ہے وہاں رندوں کا رقص میں مشغول
عجب ہے جشن بہاراں، کھلے ہیں پھول ہی پھول
بہک کے لالہ و گل نے الٹ دی رخ سے نقاب
بہار پر ہے بہار اور سرور پر ہے سرور

کوہ اولمپس (Mount Olympus) یونان کا وہ مقدس پہاڑ جسے قدیم یونانی اپنے دیوتاؤں کا مسکن جانتے تھے۔

1) یونانی دیومالا کا دیوتا پین (Pan) جسے چراگاہوں کا دیوتا مان کر گلہ بان اس کی پرستش کیا کرتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ ان کے دیوتا کا کمر سے اوپر کا دھڑ انسان کا' اور نچلا دھڑ حیوان کا ہے اس کی ٹانگیں بکرے کی ٹانگوں جیسی ہیں جن سے وہ دلدل اور چراگاہوں میں تیزی سے دوڑتا پھرتا ہے وہ موسیقی کا بہت دلدادہ ہے اور اپنے ہاتھوں میں ایک لائیر Lyre لئے اسے بجاتا رہتا ہے۔

2) باریک بین نگاہوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ مغربی شاعری میں متعارف شراب کے دیوتا بیکچس (Bacchus) کو میں نے مشرقی شاعری کی روایتی اور مانوس اصطلاح "دخت رز" میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

چند برطانوی شاعرات

انیسویں صدی سے قبل انگریزی شاعری میں بہت کم نسوانی نام سننے میں آتے ہیں مگر مذکورہ صدی میں کئی قابل ذکر شاعرات کا کلام منظر عام پر آکر بے حد مقبول ہوا۔ ان شاعرات نے میدان شعر و سخن میں اپنی صنف کی نمائندگی نہایت سلیقہ اور خوش اسلوبی سے کی۔ ان میں چند خاص خاص نام یہ ہیں۔

مسز براؤننگ، مسز ہمنیز، ایملی برانٹے، کرسٹنا روزیٹی، میری کولرج، مسز مینل، وغیرہ ان میں سے دو شاعرات، ایملی برانٹے اور کرسٹنا روزیٹی کا مختصر تذکرہ اور نمونے کے طور پر ان کی ایک ایک نظم کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ایملی برانٹے

EMILY BRONTE

(1818-48)

ایملی برانٹے ایک علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ پیٹرک برانٹے اگرچہ ایک غریب شخص تھا مگر علم کی پیاس بجھانے اپنے وطن آئرلینڈ سے کیمرج آیا اور فارغ التحصیل ہو کر یارک شائر کے ایک دور افتادہ قصبے ہاورتھ میں ایک مذہبی تعلیمی ادارے کا سربراہ (Rector of Haworth) مقرر ہوا۔ جہاں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس کی تین لڑکیوں شارلٹ' ایملی اور این بچپن ہی سے نہایت ذکی وذہین تھیں اور بڑی ہو کر یہ تینوں بہنیں صاحب تصنیف ہوئیں۔ چونکہ مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اس لئے ان کی تحریروں میں مذہب کا عنصر بے حد نظر آتا ہے۔

ایملی برانٹے کی غیر فانی تصنیف اس کا مشہور ناول (Wuthering Heights) انگریزی ادب میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ برانٹے کے کلام میں وہ زور ہے کہ بعض ناقدین کی رائے میں انگریزی شاعری میں مارلو (Marlowe) کے بعد زور کلام میں اگر کسی برطانوی شاعر یا شاعرہ کو پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ایملی برانٹے ہے اور عجب اتفاق ہے کہ مارلو ہی کی طرح عمر نے اس سے بھی وفا نہ کی اور صرف

تیس سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ذیل میں ایملی برانٹے کی مشہور نظم "No Coward Soul is Mine" کا ترجمہ اسی کی رائم اسکیم میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں مصرعہ اولیٰ چھوٹا اور مصرعہ ثانی بڑا ہے۔

ترجمہ

نہیں بزدل بخدا روح مری

نہیں بزدل بخدا روح مری
کہ جو طوفان حوادث سے لرز کر ڈر جائے
میرا ایماں وہ خدائے ازلی
نور ایماں سے ٹھہر سکتے نہیں خوف کے سائے

دل میں میرے ہے خدا خود موجود
میرا برحق وہ خدا' قادر و قیوم و قوی
خود ہی شاہد ہے جو ' اور خود مشہود
غیر فانی مری ہستی کا جو ہے راز خفی

اختلافات عقائد ہیں فضول
کہ جو بوتے ہیں دلوں میں یہاں شبہات کے بیج
جن سے حاصل ہے نہ کچھ' اور نہ وصول
درمیاں اور بڑھاتے ہیں تنفر کی خلیج

اس کے دل میں نہیں آسکتے شکوک
جس کو اس ذات پہ ایمان ویقین ہو کامل
عشق مسلک ہے مرا' عشق سلوک
اور معمور محبت سے نہاں خانہ دل

کہ محبت ہی محبت خدا
ہے محبت کا ازل سے جو ابد تک پیغام
اس کا ہر لطف' ہر اک شان عطا
وہ محبت ہے' جو ہے دونوں جہاں کا انعام

یہ زمیں' اہل زمیں' یہ افلاک
کائناتیں یہ کروڑوں' سبھی ہو جائیں فنا
پھر بھی باقی رہے وہ ذات پاک
کہ یہ سب اس سے ہیں' اور ذات ہے اسکی یکتا

موت عاجز ہے' ہر اک شے مجبور
سامنے اس کے جو طاقت ہے سو ہے بے طاقت
اک اسی ہست کا سارا ہے ظہور
لاکھ آئینوں میں تاباں وہی عکس وحدت

کرسٹنا روزیٹی

CHRISTINA ROSSETTI

(1830-94)

پچھلے صفحات میں دانتے گیبرئیل روزیٹی کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ کرسٹنا' دانتے کی چھوٹی بہن تھی' جس کے خاندانی پس منظر اور گھریلو ماحول کا اندازہ اس کے بھائی کے تذکرہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کرسٹنا کو بھی بچپن ہی سے شعروشاعری کا بڑا شوق تھا۔ لیکن شاعری کے شوق کے ساتھ ساتھ وہ بڑی خدا پرست تھی اور کٹر مذہبی خیالات رکھتی تھی۔ عیسائیت کی تعلیمات' پاکبازی اور روحانی قدریں اس کے نزدیک سب سے اہم تھیں۔ جن کا مدار نفس کشی پر تھا۔ اس کو دو مرتبہ نہایت اچھے رشتے ملے۔ اور اس کی منگنی تک ہوگئی۔ مگر نفس کشی کے رجحانات ہر مرتبہ اس پر غالب آئے اس نے ان رشتوں کو مسترد کر دیا اور ساری عمر تجرد میں گزار دی۔

کرسٹنا روزیٹی کی شاعری میں بھی مذہبی رنگ نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری کا انداز بڑا دلکش اور نہایت سبق آموز ہے۔ بعض

ناقدین کی نظر میں کرسٹنا روزیٹی دنیا کی تمام شاعرات میں سب سے بلند مقام رکھتی ہے۔

ذیل میں کرسٹنا روزیٹی کی مشہور نظم "A Birthday" کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس کا عنوان "میری سالگرہ" کی بجائے "میری برات" مجھے زیادہ پرکشش معلوم ہوا۔ نفس مضمون البتہ وہی کا وہی ہے۔ چونکہ شاعرہ پر مذہبی اثر بے حد غالب تھا جس کے سبب اس نے راہبانہ زندگی بسر کی۔ عیسائیت میں اپنے پیغمبر کی سنت سمجھتے ہوئے رہبانیت کو بہت مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ راہبہ روحانی طور پر خود کو حضرت عیسیٰ کی منگیتر تصور کرتی ہے۔ چنانچہ اس مغربی پس منظر کو میں نے مشرقی روایات میں ہندی شاعری کے مانوس نسوانی لب ولہجے میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

ترجمہ

میری برات

کس قدر خوش ہے آج دل میرا
جھومتے ہیں خوشی سے لالہ وگل
کس کا لائی پیام باد صبا!
کہ خوشی سے چہک اٹھی بلبل
وہ مجھے لینے آرہے ہیں آج
وہ جو کرتے ہیں میرے دل پر راج

آج موسم بھی کیا سہانا ہے
ایسا رنگیں کہ جیسے قوس قزح
بج رہا ہر طرف ترانہ ہے
ہے عجب طرز اور عجب ہے طرح
وہ مجھے لینے آرہے ہیں آج
وہ جو کرتے ہیں میرے دل پر راج

چلی آتی ہے بجتی شہنائی

دھوم سے آرہی ہے میری برات
اور میں سکھیوں میں بیٹھی شرمائی
ان سنی کررہی ہوں ان کی بات
میرا نوشاہ اب ہے آنے کو
مجھ کو اپنی دلہن بنانے کو

کہہ دو مشاطہ سے کہ آکے سنوار
مجھ کو پہنائے ریت کا جوڑا
کریں سکھیاں سب آکے مجھ کو سوار
کریں جلدی کہ وقت ہے تھوڑا
کھل گئی آج میرے دل کی کلی
چھوڑ سب کو پیا کے دیس چلی

امریکی شاعری کا پس منظر

ابھی تک ان صفحات میں صرف برطانوی شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ عہد وکٹوریہ میں انگریز قوم کی صنعت وتجارت، تدبر وسیاست، اور سب سے بڑھ کر ان کی ملک گیری کی بدولت ساری دنیا میں انگریزی زبان کی خوب اشاعت ہوئی۔ کسی زبان کی اشاعت کے ساتھ اس زبان کا شعروادب اپنے آپ کو خود متعارف کرا دیتا ہے۔ چنانچہ انگریزی شعروادب نے بھی برطانیہ عظمیٰ کی سرحدیں پار کر کے دور دراز برطانوی نو آبادیات میں اثر انداز ہونا شروع کیا۔ امریکہ کی سر زمین اس کے لئے موزوں ترین تھی کیونکہ یہاں انگریزی بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ جنہیں اپنے سابقہ وطن سے دلی لگاؤ تھا۔ اور جو اپنے نئے امریکی وطن کو بھی اکثر "نیوانگلینڈ" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ ۱۷۷۹ء میں تاج برطانیہ کی حاکمیت سے آزاد ہونے کے بعد بھی اہل امریکہ نے انگریزی زبان کو سینے سے لگائے رکھا اور انگریزی کو اپنی نو آزاد مملکت کی قومی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رہنے دیا۔ اٹھارویں صدی تک کسی قابل ذکر امریکی مصنف یا شاعر کا نام سننے میں نہیں آتا ہے، لیکن انیسویں صدی میں امریکی اہل قلم کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان میں سے

یہاں پر صرف چند کو یعنی ایمرسن Emerson لانگ فیلو(Longfellow) پو (Poe) اور (Whitman) وھیٹمن کا تذکرہ اوران کے کلام کا ترجمہ نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مختصراً" یہ عرض کر دینا بھی یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امریکی شعروادب نے عہد وکٹوریہ تک اپنے لئے کوئی علیحدہ سمت متعین نہیں کی تھی' اس وقت تک وہ روایتی برطانوی ڈگر پر ہی چل رہے تھے اس لئے ایمرسن اور لانگ فیلو کی شاعری کو اگر برطانوی طرز طریق کے مطابق کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ البتہ اواخر انیسویں صدی میں امریکی شاعری نے ایک نیا موڑ اختیار کیا جبکہ والٹ وھٹ مین (Walt Whitman) نے اوزان و قوافی کے روایتی قیود کو نرم کر کے غیر پابند شاعری کی جانب قدم اٹھایا۔ کہتے ہیں کہ جب اس غیرپابند شاعری کے کچھ نمونے ٹینی سن کو دکھائے گئے تو اس نے وھٹ مین کو سرے سے شاعر ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر امریکہ میں وھٹ مین کو اس جدت پر بے حد سراہا گیا۔ اور یہاں سے امریکی شاعری نے اپنے قومی تشخص کے لئے برطانوی روایتی شاعری کی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

رالف والڈو ایمرسن

RALPH WALDO EMERSON

(1803 - 82)

ایمرسن بلا کا ذہین تھا۔ صرف چودہ سال کی عمر میں وہ ہاورڈ کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ۱۸۲۹ء میں ہاورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں اس نے یورپ کا دورہ کیا۔ انگلستان میں کئی سال مقیم رہا۔ یہاں اس کی ملاقات کارلائل (Carlyle) کولرج (Coleridge) اور ورڈز ورتھ (Wordsworth) سے ہوئی۔ ۱۸۳۵ء میں وہ معلومات ومشاہدات کا ایک گرانقدر سرمایہ لے کر وطن واپس ہوا جہاں اس کی بڑی قدر کی گئی اور قومی سطح پر اس کو اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا گیا۔

۱۸۴۰ء میں اس نے ایک جریدہ (The Dial) جاری کیا۔ ۱۸۴۴ء میں اس کے مضامین (Essays) شائع ہوئے جو امریکہ اور یورپ میں یکساں طور پر بے حد مقبول ہوئے جو آج بھی اس کی عالمی شہرت کا باعث ہیں۔ ذیل میں ایمرسن کی نظم کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

ترجمہ

زمین

"میری اور تمہاری زمیں!"
"میری صرف، تمہاری نہیں!"
زمیں نے سن کر یہ تکرار
کچھ نہ کہا منہ سے زنہار
فقط آسماں کو دیکھا
کچھ آنکھوں آنکھوں میں کہا
بوڑھے آسماں کے تارے
کہنہ سال سمندر کی
گود میں آ کے چمکنے لگے
اور معمر ساحل سے
چپکے چپکے کہنے لگے
"انساں کتنا پرانا ہے؟
بنتا بڑا ہی سیانا ہے
زمیں کا مالک اپنے کو
کہتا ہے، لو اور سنو!"

دستاویز ہوئی تیار
پہنچے حق لینے حقدار
عدالتوں میں ہوئی پکار
زید گیا اور بکر آیا
ایک کے بعد اک نام چڑھا
سلسلہ یونہی چلتا رہا

بادشاہ آئے اور گئے
ملک ہزاروں فتح ہوئے
سیکڑوں نام گئے بدلے
بدلے قاعدے اور قانون
بدل گئے ان کے مضمون
کرۂ ارض مگر ہے وہی
وہی ہے خشکی اور تری
تھے جو دعویدار زمیں
وہی مگر موجود نہیں
وہ اسے رکھنا چاہتے تھے
پَر خود کو ہی رکھ نہ سکے
رکھتی ہے اب ان کو زمیں
وہ بھی کہاں ؟۔ معلوم نہیں

ہنری ویڈز ورتھ لانگ فیلو

HENRY WADSWORTH LONGFELLOW

(1807 - 82)

لانگ فیلو کو انیسویں صدی کا سب سے بڑا امریکی شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کے اجداد سترھوین صدی میں انگلستان کے شہر پلائی متھ (Plymouth) سے پلگرام فادرز(Pilgrim Fathers) کے ساتھ ترک وطن کر کے امریکہ میں آباد ہوئے تھے اس کا باپ ایک وکیل تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے پیشے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر لانگ فیلو نے اپنے لئے شعر وادب کو منتخب کیا۔ بوڈین کالج(Bodeen College) سے فارغ التحصیل ہونے پر ۱۸۲۷ء میں اس کو جدید یورپی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے فرانس، اسپین اور اٹلی بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے دو سال گزارے ان ملکوں کی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۲۹ء میں وطن واپس پہنچ کر اس کو بوڈین کالج میں جدید یورپی زبانوں کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں اسے ہاورڈ یونیورسٹی کی جانب سے پروفیسر کے عہدے کی پیش کش ہوئی جسے اس نے قبول کر لیا۔ دوسرے سال اسے جرمنی بھیج دیا گیا۔ اس

مرتبہ اس نے انگلینڈ' سویڈن اور ہالینڈ کی بھی سیاحت کی۔ جرمنی پہنچ کر وہ جرمن شعراء سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں وطن واپس آکر اس نے ہارورڈ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور درس وتدریس میں مشغول ہو گیا۔ ۱۸۵۴ء میں اپنے عہدہ سے ریٹائر ہو کر اس نے اپنی تمام سرگرمیاں شعروادب کے لئے وقف کر دیں۔ اس نے مختلف یورپی زبانوں کے ادبی شہ پاروں کو انگریزی میں منتقل کیا اور امریکی شعراء میں ایک لافانی نام چھوڑ گیا۔ ذیل میں لانگ فیلو کی دو مشہور نظموں "The Psalm of Life" اور The Village Blackswith کے منظورم تراجم پیش کئے جاتے ہیں۔

ترجمہ

عظمت کے مینار

مت درد بھرا یہ راگ الاپو، عالم امکاں کچھ بھی نہیں
اک خواب ہے ہستی انساں کی، جز خواب پریشاں کچھ بھی نہیں
لیکن، یہ قول ہے محض غلط، یہ ہستی عین حقیقت ہے
منزل جس کی کچھ قبر نہیں، آگے در پیش مسافت ہے

بیشک یہ جسم خاکی تو مٹی میں یہاں مل جائے گا
ہے روح کی منزل اور، جہاں یہ جوہر قابل جائے گا
ہاں، اس منزل کو مت بھولو، اے حرص و ہوا کے دیوانو
اوروں کو ہو کیا پہچان رہے، خود اپنے آپ کو پہچانو

تفریح و تعیش، آہ و فغاں، ہستی کے یہی دو رخ تو نہیں
"سرگرم عمل ہو اے غافل" آتی ہے ندائے عرش بریں
وہ کر چلو کام اس دنیا میں، جو دنیا والے یاد کریں
اس کاوش کو آنکھوں سے لگائیں، جاں و دل کو شاد کریں

دنیا کے عظیم انسانوں کی ہے زندگی دے رہی یہ پیغام
کیوں ان کی طرح ہم بھی نہ کریں دنیا میں روشن اپنا نام
جو ظلمت کے طوفانوں میں بھٹکوں کا سہارا بن جائے
ہر دور انسانی کے لئے روشن وہ منارہ بن جائے

مت صدق وصفا اور مہر و وفا کا ہاتھ سے تم دامن چھوڑو
ڈٹ جاؤ مقابل باطل کے' مت ہرگز حق سے منہ موڑو
انداز ہوا کرتا ہے یہی ان عظمت کے میناروں کا
ہوتا رہتا ہے ذکر سدا ان کے اعلیٰ کرداروں کا

گاؤں کا لوہار

لانگ فیلو (آزاد ترجمہ)

سایہ دار اک درخت کے نیچے
کار گہہ گاؤں کے لوہار کی ہے
اور لوہار جسم کا مضبوط
ہٹا کٹا بھلا اک آدمی ہے
اس کے رگ ریشے آہن و فولاد
جن سے اپنی کماتا روزی ہے

گھنے، لمبے، سیاہ اس کے بال
رنگ چہرے کا کچھ گیا ہے جھلس
بجز حق اور حلال کی روٹی
نہیں رکھتا ہے کوئی اور ہوس
بات کرتا ہے وہ ملا کر آنکھ
کہ نہ مقروض ہے، نہ ہے بے بس

صبح تا شام کار گہہ اس کی
کھلی رہتی ہے، ہوتا رہتا ہے کام
کبھی آتی ہے دھونکنی کی صدا
کبھی گھن کے نیچے تلے اقدام
جیسے گرجا کا گھنٹہ وقت غروب
آمد شب کا دے رہا ہو پیام

بچے اسکول سے گھر آتے ہوئے
جھانکتے کارگہہ کے ہیں اندر
دیکھتے ہیں لپکتے شعلوں کو
ہیں کبھی دھونکنی پہ کرتے نظر
مزہ چنگاریاں پکڑنے میں
ان کو آتا، جو گرتیں اڑ اڑ کر

اپنے بچوں کے ساتھ ہر اتوار
گرجا جانے کا ہے بڑا پابند
مانگتا ہے دعا عقیدت سے
اور ہے سنتا بغور وعظ اور پند
اپنی بیٹی کی حمد خوانی پر
ہونے لگتی ہیں اس کی آنکھیں بند

گونجنے لگتی اس کے کانوں میں
اپنی بیوی کی مدبھری آواز

جیسے جنت کے اک دریچے میں
روح اس کی ہو زمزمہ پرواز
اور آنسو وہ پونچھنے لگتا
کر کے یاد اپنی ہمدم و ہمراز

الغرض رنج اور راحت میں
رکھتا ہے اپنے کام سے وہ کام
ہر نئی صبح اک نیا آغاز
اور ہر شام ایک نیک انجام
گزر اوقات کے لئے ہے بہت
اپنے گاڑھے پسینے کا انعام

محترم دوست ! شکریہ تیرا
کہ دیا تو نے ایک درس عجیب
یعنی اس کارگاہ ہستی میں
خود کو تپنے کی ہم بھی دیں ترغیب
اور مشقت کے ناگوارا گھن
سہ کے اپنے بنائیں بگڑے نصیب

Edgar Allan Poe

(1809- 1849)

ایڈگر ایلن پو

ایڈ گر ایلن پو (۱۸۰۹ء تا ۱۸۴۹ء) بالٹی مور کے ایک متوسط امریکی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی صرف دو برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پو کی ابتدائی زندگی بڑے نا مساعد حالات میں بسر ہوئی۔ یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لیا اور کچھ عرصہ امریکی فوج میں ملازمت کی۔ اس کے بعد اس نے قلم کو ذریعہ معاش بنایا۔ وہ فطرتاً" ایک شاعر ُنقاد اور افسانہ نگار تھا۔ وہ بیک وقت کئی کئی اخبارات اور رسائل کے لئے لکھتا رہا۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۸۲۷ء میں اور دوسرا ۱۸۳۱ء میں شائع ہوا جنہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن اس کی شہرت کا اصل سبب اس کے دلچسپ اور سنسنی خیز افسانے تھے جنہیں اس کے عہد میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ذیل میں پو کی مشہور نظم (To Helen) کا منظوم ترجمہ (ہیلن) کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔

ترجمہ

ہیلن

ہیلن، ترے جمال کا شہرہ ہے آج تک
میں دیکھتا ہوں چشم تحیر سے وہ دھنک

جس میں رچا ہوا لب وعارض کا تیرے رنگ
ہے جس سے رزمیہ میں ترے آج بھی ترنگ

شاعر نے تیرے حسن کو بخشا ہے وہ دوام
قائم رہے گا جس سے ترا حسن تا قیام

ہے تیرے حسن کا وہی عالم، وہی کشش
اب تک دلوں میں تیرے لئے ہے وہی خلش

جنت ترا خیال، تصور ترا بہشت
تو ہے جمالیات کی اک شرح زر نوشت

اک میں، کہ تیرے حسن کا نادیدہ مبتلا
ہوں جب وفور شوق میں ماضی میں جھانکتا

موجوں میں رنگ وبو کی مری کشتی خیال
چلتی ہے لے کے عرصہ ماضی میں بہرحال

ساحل وہ عطر بیز، سمندر وہ مشکبار
میں جس کے درمیاں سے گذر کر افق کے پار

آخر کو جا پہنچتا ہوں اس دیس میں جہاں
عہد قدیم کے وہ جہاز اور جہاز راں

خوش آمدید ہیں مجھے کہتے اور آفریں
اور پھر، دکھائی دیتی ہے مجھ کو وہ نازنیں

طوفاں کو روندتی ہوئی موجوں پہ جو سوار
زلفیں ہوا سے اڑتی ہوئی رخ پہ بار بار

اک حسن بے پناہ، نہ ٹھہرے جہاں نگاہ
وہ رعب حسن، سرنگوں شاہان کج کلاہ

قدموں میں جس کے حکمت یونان و شان روم
پروانے شمع حسن کی جس کے مہ و نجوم

ہے آج بھی مگر دل شاعر میں جلوہ گر
تو بھی جہاں امر ہے' ترا حسن بھی امر

میں اب بھی دیکھتا ہوں ترے حسن کی جھلک
خاموشیوں میں شب کی ابھر کر سر فلک

جو ہے پکارتی کسی ہومر کو بار بار
تخلیق کردے پھر کوئی ویسا ہی شاہکار

والٹ وھٹ مین

Walt Whitman

(1819- 1892)

ان اوراق میں امریکی شاعری کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے عرض کیا جا چکا ہے کہ وھٹ مین نے اوزان وقوافی کی روایتی قیود کو ختم کر کے غیر پابند شاعری کی جانب قدم اٹھایا۔ اس جدت کو امریکہ میں نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ روایتی شاعری کی ڈگر سے ہٹ کر اپنے قومی تشخص کے لئے اس روش کو اختیار کیا۔

وھٹ مین نیویارک میں پیدا ہوا۔ گیارہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑ دیا اور مختلف پیشوں کو ذریعہ معاش بناتا رہا۔ امریکی خانہ جنگی کے بعد وہ واشنگٹن منتقل ہوگیا۔ اس کا شعری مجموعی (Leaves of grass) ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ وہ ایک آزاد مزاج شخص تھا اور یہی آزاد مزاجی کا عنصر اس کی نظموں میں کار فرما ہے۔ اور شاید اسی آزادی طبع کے باعث اس نے اپنی "شاعری" کو بھی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔

ذیل میں وھٹ مین کی ایک نثری نظم (Sparkles from the wheel) کا ترجمہ نثری نظم کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مجموعہ تراجم میں صرف ایک یہی کاوش اوزان وقوافی سے بے نیاز ہے۔ جس سے وھٹ مین کی طرز شاعری کی ایک جھلک دکھانا مقصود ہے۔

والٹ وھٹ مین

ترجمہ

سونے کی پھلجھڑیاں

شہر کی مصروف سڑک کے کنارے بچوں کے غول میں
ایک جانب میں بھی کھڑا ہوں،
جو ایک بوڑھے سانگر کو چاقو پر دھار رکھتے دیکھ رہے ہیں
سان کے پہیئے کی گردش
سانگر کے پیر اور گھٹنے کی نپی تلی جنبش سے ہم آہنگ ہے۔
پہیہ تیزی سے ایک سمت میں چکر کاٹتا،
پھر آہستہ ہو کر دم بھر کو رک جاتا، اور فوراً ہی مخالف سمت میں
اسی طرح چکر کاٹنے لگتا۔
سانگر کے مشاق ہاتھ چاقو کے پھل کو
چابکدستی سے الٹتے پلٹتے جاتے۔
جب وہ چاقو کا پھل سان پر آہستہ سے دباتا
تو پہیئے سے سونے کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتیں

مصروف سڑک کی گہما گہمی سے بے نیاز'
بچوں کی طرح میں بھی صرف اس رونی صورت
بوڑھے سانگر کو دیکھنے میں محو ہوں جو اپنے
میلے کپڑوں پر چمڑے کا ایپرن باندھے اپنے کام میں منہمک ہے۔
سان کا پہیہ دونوں سمتوں میں گھوم رہا ہے۔
چاقو کے پھل پر دھار رکھی جارہی ہے۔
اس کی رگڑ سے ایک بھرائی بے سری آواز نکل رہی ہے
اور پہیے سے سونے کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔
اپنے گرد وپیش سے بیگانہ' اس بوڑھے سانگر پر
میری نظریں اس طرح جم کر رہ گئی ہیں
جیسے اس نے مجھ کو بھی اپنی گرفت میں جکڑ لیا ہو'
گویا وہ میرے کند شعور پر بھی صیقل کر رہا ہو'
جس کی رگڑ کی بھرائی آواز ایک سریلا راگ الاپ رہی ہو
اور میرے اندر بھی سونے کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔

بیسویں صدی کی انگریزی شاعری

اوائل بیسویں صدی کے جن شعراء کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے وہ درحقیقت انیسویں صدی ہی کی پیداوار ہیں۔ اس لحاظ سے اگر انھیں عہد وکٹوریہ کی باقیات یا تسلسل کہا جائے۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ ان میں ہارڈی' برجز' تھامپسن' کپلنگ' ایٹس وغیرہ چند اہم نام ہیں۔

تذکرۃ" یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ بیسویں صدی کی انگریزی شاعری کی تخلیق میں بیرون برطانیہ' برطانوی نو آبادیات نے بھی کسی حد تک قابل قدر اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ برصغیر نے بھی جہاں کسی علاقے کی مروجہ زبان انگریزی نہیں تھی۔ ٹیگور' سروجنی نائیڈو اور دوسرے کئی قابل ذکر شعراء پیدا کیے۔ اس کے علاوہ امریکہ میں عہد حاضر کے ترجمان شعراء عذرا پاؤنڈ' ایلیٹ' فراسٹ وغیرہ چند اہم نام ہیں۔ ان میں سے بعض کے حالات اور نمونہ کلام کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کا نصف اول دو عالمی جنگوں سے داغدار ہے جس کے سبب انداز فکر بدلا اور سوچ کو نئی سمتوں کی جستجو ہوئی۔ پہلی عالمی جنگ سے متاثر شاعری میں جہاں توپوں کی گھن گرج کی بازگشت ہے وہاں مجروح انسانیت کی آہ و بکا بھی واضح طور پر سنی جا سکتی ہیں۔ اور پھر دوسری عالمی جنگ نے تو ساری دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا۔ انقلاب پر انقلاب آئے۔ سیاسی' سماجی' اخلاقی' نظریاتی' اور ہر طرح کے انقلاب جن کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ مشینی ایجادات نے سوچ کو

مادیئت سے حد درجہ مرعوب بلکہ مغلوب کردیا۔ قدریں بدل گئیں۔ زندگی کئی گنا تیز تر ہوگئی۔ پانے (Wrench) اور پیچکش (Screw - Driver) نے اس دوڑ میں قلم کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ قلم کی وہ کرشمہ کاریاں جنہیں باریک بینی اور ذوق سلیم کی عینکوں کے بغیر پرکھنا ممکن نہیں۔ ننگی آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ مصروف زندگی کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ یہ عینکیں لگا کر قلم کی تخلیقات کی داد دے سکے۔ یہاں پر اوائل صدی کے ممتاز شاعر رابرٹ برجز کے یہ الفاظ نقل کردینا بے محل نہ ہوگا جو اس نے اس ضمن میں سالوں پہلے کہہ دیے تھے کہ "انگریزی شاعری میں پابند نظم کا تمام سرمایہ ختم ہوچکا ہے۔ کہنے والوں نے سب کچھ کہہ دیا اور نئے کہنے والوں کے لئے کچھ باقی نہیں چھوڑا"۔

بیسویں صدی کی شاعری فی زمانہ ان مسائل سے دو چار ہے اور دور حاضر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لئے نت نئے تجربات کرنے پر مجبور ہے۔ ہماری نیک تمنائیں اس کے ساتھ ہیں۔

ٹامس ہارڈی

THOMAS HARDY

(1840-1928)

ٹامس ہارڈی جو عام طور پر ایک ناول نگار کی حیثیت سے معروف ہے۔ اکثر ناقدین کی نظر میں ناول نگار سے کہیں بہتر ایک شاعر ہے۔ جبکہ وہ اس کے ہمعصر اسٹیونسن (Stevenson) کو شاعر سے بہتر ناول نگار کا درجہ دیتے ہیں۔ ہارڈی ڈورسٹ شائر (Dorestshire) انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ ڈورسٹ میں تعلیم پائی۔ اور بطور ایک عمارت ساز (Architect) اس نے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ ۱۸۶۷-۷۱ء کے دوران جبکہ وہ لندن میں عمارت سازی کے کاموں میں مصروف تھا۔ اسے شاعری اور ناول نگاری کا شوق ہوا۔ ۱۸۶۷-۸ء کے دوران اس نے اپنا پہلا ناول (The Poor Man and the Lady) مکمل کیا مگر ناشروں نے چھاپنے سے انکار کردیا۔ ایک سینئر معاصر، شاعر اور ناول نگار، میریڈتھ (Meredith) کے مشورہ پر اس نے اپنا انداز تحریر بدلا اور ایک دوسرا ناول 'Desparate Remedies' پیش کیا جو اشاعت کے لئے قبول کرلیا گیا۔ اسی زمانے میں اسے کارنوال (Cornival) کے علاقے میں اپنے پیشہ ورانہ کام کے سلسلہ میں کچھ عرصہ قیام کرنا پڑا۔ اور وہیں اس نے شادی کرلی۔ ۱۸۷۲-۳ء میں اس نے 'A Pair of Blue Eyes' مکمل کی جو اس کی شہرت کا باعث ہوئی۔ دوسرے سال اس کا ایک اور ناول (Far From the Maddening Crowd) شائع ہوا جس نے اس کے فن کی توثیق اور انگریزی

ادب کے بہترین ناول نگاروں میں اس کے ایک مقام کی تصدیق کردی۔ اس کے بعد اس نے عمارت سازی کا پیشہ ترک کرکے صرف قلم کو اپنا وسیلہ معاش بنایا اور اپنے آبائی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کرکے ساری زندگی شعرو ادب کی تخلیق میں بسر کی۔

شاعری اگرچہ وہ ۱۸۶۷ء سے کررہا تھا مگر اس کا پہلا شعری مجموعہ ۱۸۹۸ء میں منظرعام پر آیا جسے بیحد پسند کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اس کو (Order of Merit) کے اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ اخیر عمر تک لکھتا رہا۔ اس نے بے شمار تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔ اپنے آخری ایام میں وہ زیادہ تر نظمیں لکھ کر دل بہلاتا رہا۔

ذیل میں ہارڈی کی مشہور نظم 'The Man He Killed' کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو اس نے پہلی عالمی جنگ سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔

ترجمہ

گولی

ادھر عدو نے ادھر ہم نے مورچے تھے جمائے
ملارہے تھے اسے خاک میں جو سامنے آئے
کہ تاکا اس نے مجھے، اس سے پیشتر میں نے
تمام کردیا کام اس کا، مار ڈالا اسے
تھا مار ڈالا اسے میں نے کیونکہ .... ہاں کیونکہ
تھا میرا ایک وہ دشمن، تھی سیدھی صاف وجہ
مگر .... مگر اسے میں نے تو تھا نہ دیکھا تک
تھی خواب و خیال میں دیکھی کبھی نہ اس کی جھلک
تو پھر .... تو پھر، مرا دشمن وہ کیسا، میرے خدا!
مری سمجھ میں تو آتا نہیں کچھ اس کے سوا
کہ شاید ایک وہ بیروزگار میری طرح
تھا اپنے شہر میں پھرتا وہ خوار میری طرح

عجب نہیں ہے کہ شاید وہ بھوک کا مارا
تھا میری طرح سے کوئی غریب بیچارہ
کہ جس نے نام مری طرح سے لکھایا ہو
مری ہی طرح یہاں لام پر وہ آیا ہو

اگر یہ جنگ نہ ہوتی، ہم اور کہیں ملتے
ہمارے ملنے کے انداز اور ہی ہوتے
ہم ایک دوسرے کو پیش کرتے ہوتے جام
مناتے ہوتے ہم اک ساتھ خوبصورت شام
مگر ہیں ضابطہ جنگ کے جدا اخلاق
لہو سے مثل گلستاں ہیں سرخ یہ اوراق
سمجھتے جنگ میں ہر ناروا کو ہم ہیں روا
بلا سے، گونجتی گر ہے صدائے واویلا
ہیں خاک و خون سے جی بھر کے کھیلتے ہولی
ہر ایک بات کا دیتے جواب ہیں گولی

رابرٹ برجز

ROBERT BRIDGES

(1844-1930)

رابرٹ برجز انگلستان کے علاقہ کینٹ (Kent) کے ایک متمول زمیندار کے گھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم ایٹن (Eton) میں پائی۔ اس کے بعد آکسفورڈ چلا گیا۔ جہاں اس کی ملاقات ہاپکنز (Hopkins) سے ہوئی اور یہ دونوں شاعر زندگی بھر کے لئے بہترین گہرے دوست بن گئے۔

برجز نے علم طب میں ڈگری حاصل کی تھی۔ اور ایک عرصہ تک لندن ہاسپٹل میں بطور ایک ڈاکٹر خدمات سرانجام دیں مگر وہ ایک شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ معروف رہا۔ اس کے کلام میں بڑی تاثیر اور ترنم ہے جس کے سبب اسے اپنے وقت کا بہترین شاعر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے وقت کا مانا ہوا عروض داں تھا۔ ۱۹۱۳ء میں اسے ملک الشعرائے انگلستان (Poet Laureate of England) کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے دور میں انگریزی شاعری نے چولا بدلنا شروع کردیا تھا۔ نئے نئے اسلوب و انداز اختراع ہونے لگے تھے۔ اور آزاد شاعری کی طرف عموماً رجحان بڑھ رہا تھا۔ مگر برجز نے اپنی عروض دانی کی بنیاد پر پابند شاعری میں نئی راہیں تلاش کیں اور بحور و اوزان میں جدت اور نئی تراش خراش سے کام لیا۔

ذیل میں رابرٹ برجز کی مشہور نظم "Nightingales" کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نظم برجز کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا ترجمہ اصل نظم کی رائم اسکیم میں ملاحظہ ہو:۔

بلبلیں

ہوں گے کتنے خوبصورت وہ مناظر پر شکوہ
ندیاں بہتی ہوئی، مہکا ہوا دامان کوہ
بلبلو، یہ گیت سیکھے ہیں جہاں
کاش ان کوہ وبیاباں میں مرا ہوتا گزر
سیر کرتا، دیکھتا منظر وہ فردوس نظر
لے چلو مجھ کو بھی ساتھ اپنے وہاں

خشک ہیں وہ کوہ اور سوکھی پڑی ہیں ندیاں
ہیں ہمارے گیت آہ و اشک و فریاد و فغاں
ٹوٹنے کی شیشۂ دل کی صدا
ہم سراپا درد ہیں، اور ہیں سراسر رنج ویاس
تلخیٔ خون جگر ہے اپنے نغموں کی مٹھاس
فن ہمارا اک نوائے بے نوا!

گوش انساں کی ضیافت کے لئے خون جگر
پیش کردیتے ہیں ہم اپنا کلیجہ چیر کر
اور دم رخصت چمن سے مثل شب
ہر گل رنگیں کو کرتے ہیں عطا اپنا لہو
جس سے بھرلیتا ہے ہر ساز طرب اپنا سبو
مسکراتی ہے سحر جس کے سبب

رڈیرڈکپلنگ

RUDYARD KIPLING

(1865-1936)

رڈیرڈ کپلنگ بمبئ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز تھا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا ذہین تھا۔ جب کچھ بڑا ہوا تو والدین انگلستان واپس آگئے جہاں اسنے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ابتدا ہی سے اس کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ فارغ التحصیل ہوکر اس نے قلم کو وسیلہ معاش بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی کہانیاں اور نظمیں برطانوی جرائد میں شائع ہوکر بڑی مقبول ہوئیں۔ اس کی تخلیقات میں عام طور پر برطانوی سامراج کی شوکت وعظمت کی ستائش اور مدح سرائی ہوتی تھی۔ اس کے انداز تحریر اور زور قلم سے متاثر ہوکر برطانوی ہند کے مشہور اخبار پائنیر الہ آباد (The Pioneer, Allahabad) نے جسے اس دور کی برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نوجوان ابھرتے ہوئے صاحب قلم کو اپنے اخبار کی اڈیٹری پیش کی۔ کپلنگ نے یہ پیشکش قبول کرلی اور بھاری تنخواہ پر چند سال کے معاہدہ پر دوبارہ وارد ہندوستان ہوا۔ اس کے

زمانے میں اس اخبار کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور اس کی اشاعت برطانوی ہند کی سرحدیں پار کرکے دور دراز ملکوں تک جا پہنچی۔ پائنیر اخبار کی یہ شہرت کپلنگ کے چلے جانے کے بعد بھی بہت عرصہ تک قائم رہی۔ پائنیر کا معاہدہ ختم ہوتے ہی ایک دوسرے نیم سرکاری اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور" نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ اس عرصے میں کپلنگ کو بہت شہرت حاصل ہوچکی تھی۔ تقریباً پانچ سال ہندوستان میں قیام کرکے وہ واپس انگلستان چلا گیا اور وہاں اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ اس نے بہت کچھ لکھا۔ اور ایک صحافی، نثر نگار، شاعر کی حیثیت سے ساری دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اس کو ادب کا نوبل پرائز ملا۔ اس نے بچوں کے لئے بھی دو بڑے دلچسپ ناول 'The Jungle Book' (1895) اور 'Kim' (1901) لکھے۔ اول الذکر کا نہایت خوبصورت ترجمہ اردو کے مشہور نثر نگار عنایت اللہ دہلوی نے "زلفی" کے نام سے کیا جو بچوں کے اردو ادب میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔

ذیل میں کپلنگ کی ایک چھوٹی سی نہایت سبق آموز نظم 'Six Serving men' کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا پہلا اسٹنزا زبان زد خاص و عام ہے۔

I have six honest serving-men,
They taught me all I knew;
Their names are What and Where and When
And How and Why and Who.

ترجمہ

چھ معتبر طاعت گزار

ہیں مرے چھ معتبر طاعت گزار
جن سے روشن مجھ پہ اسرار جہاں
نام ان کے ہیں ہر اک پر آشکار
کون، کیا، کس طرح، کیوں، کب اور کہاں

چھانتے پھرتے ہیں میرے حکم پر
کونا کونا عالم امکان کا
ذرے ذرے کی وہ لاتے ہیں خبر
گر محقق ہو، تو ہو اس شان کا

ختم کر چکتے ہیں اپنا کام جب
کرنے دیتا ہوں انہیں آرام بھی
بے سبب کرتا نہیں ان کو طلب
کرتے وہ آرام بھی ہیں کام بھی

لیکن اک مرد خدا رکھتے ہیں پاس
کون، کیا اک لاکھ اور دو لاکھ کیوں
پھر بھی رہتے ہیں ہمیشہ بدحواس
بدحواسی کو اب ان کی کیا کہوں!

ریوپرٹ بروک

RUPERT BROOKE
(1887-1915)

یہ نوعمر شاعر رگبی Rugby میں پیدا ہوا اور وہیں کے مشہور و معروف رگبی اسکول میں تعلیم پائی جہاں اس کا باپ ایک ٹیچر تھا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا ذہین اور بڑا پھرتیلا تھا۔ کرکٹ اور فٹ بال کا نہایت عمدہ کھلاڑی۔ خدا نے شکل و صورت بھی بڑی جاذب نظر بنائی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں کیمرج سے میٹرک پاس کرکے یونیورسٹی میں داخل ہوا اور بڑی فعال زندگی گزاری۔ پھر مزید تعلیم کے لئے جرمنی چلا گیا۔ کچھ عرصہ اٹلی کے سیاحت کی۔ ۱۹۱۲ء میں اس کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوکر منظر عام پر آیا جس میں نوعمر اور ناپختہ ذہن کے انقلابی خیالات کا اظہار تھا۔ ۱۴۔۱۹۱۳ء کا زمانہ اس نے امریکہ اور کینیڈا میں گزارا۔ اسی دوران میں عالمی جنگ چھڑ گئی۔ بروک رائل نیوی میں کمیشن لے کر جنگ کے طوفان سے نبرد آزما ہونے کے لئے نکل کھڑا ہوا اور ۱۹۱۵ء میں درہ دانیال کے قریب ایک بحری مہم میں جاں بحق ہوا۔ بائرن کی طرح اس ہونہار شاعر کی جوان موت کا ادبی حلقوں میں ایک عرصہ تک ماتم رہا۔ مشہور وزیر اعظم برطانیہ آنجہانی چرچل بھی ذاتی طور پر اس کے دوستوں میں تھے۔ اور اس کو یاد کرکے اس کی شاعرانہ عظمت کو زبردست خراج تحسین ادا کیا کرتے تھے۔ ذیل میں ریوپرٹ بروک کے مشہور سانٹ "Clouds" کا ترجمہ سانٹ ہی کی صورت میں ملاحظہ ہو:۔

ترجمہ

بادل

وہ افق سے تاافق اک کارواں شوریدہ سر
پر نہ آواز جرس کوئی' نہ شور این و آں
اپنے ہاتھوں اپنے دامن کی اڑاتے دھجیاں
جارہے ہیں ایک کے پیچھے وہ اک، جانے کدھر

کچھ ڈگر سے ہٹ کے اک جانب گئے ہیں یوں ٹھہر
دیکھتے ہوں دور سے جیسے تماشائے جہاں
اک عجب سا ہے تاثر ان کی ہیت سے عیاں
حق میں انساں کے دعا کرتے ہوئے تھامے جگر

کہتے ہیں مرتی نہیں روحیں' ہیں رہتی آس پاس
اپنے خویش و اقربا کے رنج وراحت میں شریک
کیا عجب یہ آسمانی قافلے' خاموش' اداس
جارہے ہوں مانگنے ان کے لئے رحمت کی بھیک
یا چھپائے بادلوں میں منھ' علیٰ **ھذاالقیاس**
ہوں گزر جاتے وہ ان کو دیکھ کر پست و رکیک

رونلڈ میکفی

RONALD MACFIE

(d.1931)

رونلڈمکفی کا ذکر سرسری طور پر "اے کریٹیکل ہسٹری آف انگلش پوئٹری" مصنفہ گریئرسن اینڈ اسمتھ میں انیسویں صدی کی آخری دہائی کے شعراء میں کیا ہے اور اس کے کلام کے نمونے کے طور پر اس کی ایک خوبصورت نظم بھی دی ہے۔ مجھے یہ نظم بہت ہی اچھی لگی اور اس کا ترجمہ بس یوں سمجھ لیجئے کہ خود بخود ہوگیا۔ یہ بھی میری ابتدائی کاوشوں میں سے ایک ہے۔ جب مجھے اپنی ان تمام کاوشوں کو کتابی شکل میں یکجا کرنے کا خیال آیا اور شعراء کے حالات جمع کرنے کی جستجو ہوئی تو متذکرہ کتاب اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے مدد لی۔ انسائیکلوپیڈیا میں میکفی کا نام تک نہیں ملا، اول الذکر کتاب میں اس کے حالات زندگی نہیں ملے برٹش کونسل کراچی سے رجوع کیا تو انہوں نے مختصراً یہ تفصیلات بہم پہنچائیں۔

رونلڈ کیمپ بیل میکفی (ایم۔اے۔ ایم۔بی۔ سی۔ ایم۔ ایل ایل ڈی) ڈاکٹر آف میڈیسن۔ مصنف اور ڈاکٹر۔ایبرڈین یونیورسٹی (اسکاٹ لینڈ) میں تعلیم پائی اور وہیں شعبہ طب سے منسلک ہوا۔ پھر مختلف طبی اداروں میں اعلیٰ ذمہ داریوں پر فائز رہا۔ دنیا بھر کی سیروسیاحت کی۔ آخری عمر فرانس میں بسر کی

اور وہیں ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔ ان مختصر حالات زندگی کے ساتھ انہوں نے اس کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست بھی دی جن میں نصف سے زیادہ علم طب اور حفظان صحت پر ہیں۔ چار اس کے شعری مجموعے ہیں اور چند ڈرامے اور چند افسانوں کے مجموعے۔

گریئرسن اور اسمتھ نے اپنی کتاب میں اس کی ایک طویل نظم War کی بہت تعریف کی ہے۔ ذیل میں میکفی کی جس نظم کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے اس کا اصل عنوان مجھ کو نہیں مل سکا۔ میں نے نفس مضمون کے اعتبار سے اس کا عنوان "آمنا سامنا" تجویز کیا ہے۔ یہ آمنا سامنا درحقیقت ایک ہی شخصیت کے چند پہلوؤں کا ہے جنہیں شاعر نے ایک ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے کے کرداروں کے نام بھی اسی مناسبت سے وضع کئے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

Ronald Macfie

(آزاد ترجمہ)

آمنا سامنا

"میں جو ہوں" اور "کاش میں ہوتا" وہ میرا لاشعور
مل گئے اک دن اچانک بے نیاز نزد و دور
تھیں مقابل ایک سی پر مختلف دو ہستیاں
ایک مغموم و ملول' اک کامران و شادماں
روز روشن اور شب تاریک جیسے ساتھ ساتھ
ایک جا جیسے خوشی اور غم لئے ہاتھوں میں ہاتھ
دیکھتا اس کو رہا جانے میں کتنی دیر تک
مثل آئینہ تھا حیراں دیکھ کر اپنی جھلک
اور پھر وہ مسکرا کر جیسے غائب ہوگیا
گویا بخت خفتہ پھر کروٹ بدل کر سو گیا

اور جب ملتے ہیں باہم "میں جو ہوں" اور "میں جو تھا"
یہ گماں ہوتا ہے پہلے بھی ہوں اس سے مل چکا
ہو کے رہ جاتا ہے برہم یہ نظام ہست و بود
سوچتا ہوں کیا عدم میں بھی ہے امکان وجود؟
کیا یہ جیتی جاگتی ہیں زندگی محض ایک خواب؟
کیا عدم ہی ہے حقیقت اور حقیقت ہے سراب؟
میری کج بحثی پہ وہ بولا کہ اے مدہوش و مست
کیا نہیں ہے یاد تجھ کو اپنا اقرار الست؟
یاد مجھ کو یہ دلا کر وہ بھی غائب ہوگیا
اور بھٹک کر این و آں میں پھر کہیں میں کھو گیا

"میں جو ہوں" اور "میں جو ہوجاؤں گا" اک دن مل گئے
فکر کے سربستہ غنچے پھول بن کر کھل گئے
مادیّت کی صدا آئی کہ ہے خوف اجل
ذہن انساں پر مسلط اور پئے رد عمل
خود کھڑے اس نے کئے یہ عقدہ پیچیدہ ہیں
تلخ گرچہ یہ حقائق ہیں مگر سنجیدہ ہیں
فکریت بولی یہ سطحی فکر کا انداز ہے
زندگی خود مادیّت کے لئے اک راز ہے
جب سر پردہ حقائق سے یہ کچھ واقف نہیں
پھر پس پردہ بھلا کیا جانے یہ کوتاہ بیں

"میں جو ہوں" اور "میں جو تھا" اور "میں جو ہو جاؤں گا اب"

سے زمانی ہستیاں یہ جمع ہو جاتی ہیں جب
ہے اٹھا لیتا کوئی بدمست پھر ساز الست
اور کوئی گردش میں لاتا ہے مئے قدح شکست
حال پر کھلتا ہے جب ماضی و مستقبل کا حال
کچھ نہیں رہتی ہے گنجائش برائے قیل و قال
خود پکار اٹھتا ہے دل لازم ہے تطہیر حیات
ورد کرتی ہے زباں والباقیات الصالحات

ولیم بٹلرایٹس

WILLIAM BUTLER YEATS

(1865-1939)

ولیم بٹلرایٹس (۱۸۶۵ تا ۱۹۳۹) اوائل بیسویں صدی کے شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ وہ ڈبلن کے ایک معروف گھرانے میں پیدا ہوا۔ شاعر، ڈرامہ نگار اور قومی سیاستداں کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ۱۹۲۳ء میں اس کو ادب کا نوبل پرائز ملا۔

ایٹس کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ آئرلینڈ کے جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی شاعری میں بھی آئرلینڈ کے مناظر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۸۸۵ء میں اور دوسرا ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اور اسی سال اس کے ادبی مقالات کتابی صورت میں منظرعام پر آئے۔ پھر وہ ڈرامہ نگاری کی طرف متوجہ ہوا اور ۱۹۰۲ء میں اپنے چند مداحوں کی معاونت سے ڈبلن میں ایک تھیٹر قائم کیا جہاں اس کے ڈرامے بعض نظم میں اور بعض نثر میں اسٹیج ہوکر مقبول ہوئے۔ ادبی سرگرمیوں کے ساتھ اس کی سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۸ء کے دوران وہ آئرش فری اسٹیٹ کی سینٹ میں ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے شامل رہا۔

ذیل میں ایٹس کی ایک مشہور نظم (The Rose of the World) کا منظوم ترجمہ اوریجنل رائم اسکیم میں پیش کیا جارہا ہے۔ جو اس نے پہلی عالمی جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثر ہوکر لکھی تھی۔

تبسم سوگوار

ترجمہ

حسن کامل، جس کا اک پرتو جہاں رنگ و بو
ہے لب لعلیں پہ رقصاں اک تبسم سوگوار
سرخ تر رنگ چمن ہے سرخ تر رنگ بہار
کیا قلم ہومر کا پھر بھر کر ڑائے کا لہو
کر رہا ہے فکر تازہ شاہکار

ہم سے محنت کش رواں ہیں کارواں در کارواں
اور ادھر روحوں کے دستے پرفشاں سوئے عدم
جیسے پت جھڑ کے بگولے اٹھ رہے ہوں دمبدم
کائناتی وسعتوں میں مثل گرد آسماں
ہاں، زمین کا بوجھ ہوجائے گا کم

قدسیو، ہو جاؤ سجدہ ریز، عہد اولین
آن پہنچا، جب نہ تھا کوئی بجز ذات احد
جس نے خلق انساں کو فرماکر شعور نیک و بد
اس کو بخشا تھا کہ سیدھی راہ سے بھٹکے نہیں
وار لیکن کرگیا جہل خرد

جان میسفیلڈ

JOHN MASEFIELD

(1878-1967)

میسفیلڈ برک شائر (Burkshire) انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ کنگز اسکول واروک (Warwick) میں تعلیم پائی۔ ایک ملاح کی حیثیت سے اپنے کیرئیر کا آغاز کیا۔ کئی سال سمندر میں گذارے۔ لمبے لمبے بحری سفر کیے۔ سمندری زندگی سے کنارہ کش ہو کر چند سال ریاستہائے امریکہ میں بسر کیے۔ اس کے بعد دوبارہ انگلستان کا رخ کیا اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ عرصہ تک مانچسٹر گارجین سے منسلک رہا۔ لندن میں رہائش اختیار کی۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ 'The Salt Water Ballods' ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت نظموں پر مشتمل تھا۔ جس کی ہر نظم سمندر سے متعلق تھی۔ اس کا یہ شعری مجموعہ انگلینڈ اور امریکہ میں یکساں طور پر بے حد مقبول اور اس کی عالمی شہرت کا باعث ہوا۔ عالمی جنگ اول سے پہلے اس کے دو اور شعری مجموعے جو لمبی نظموں پر مشتمل تھے 'The Ever Lasting Mercy' اور 'The Dauder' شائع ہوئے۔ جنگ کے بعد اس کا ایک اور مجموعہ 'Reynard the Fox' منظر عام پر آیا۔ جس میں جنگ کے علاوہ انگلستان کی دیہی زندگی کے مسائل کو شاعرانہ

فنکاری سے پیش کیا گیا تھا۔ اس کی تمام تخلیقات مجموعی طور پر اتنی پسند کی گئیں کہ ۱۹۳۰ء میں رابرٹ برجز کے انتقال کے بعد اس کو انگلستان کا ملک الشعراء (Poet Laureate of England) اور ۱۹۳۵ء میں آرڈر آف میرٹ' کے اعزازات سے نوازا گیا۔ میسفیلڈ نے نظموں کے علاوہ کئی بچوں کے ناول لکھے جو بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہوئے۔

ذیل میں میسفیلڈ کی شاہکار نظم 'Sea Fever' کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ شاعر نے اپنی انگریزی نظم کے وزن کو بادبانی جہاز کے ہچکولوں سے ہم آہنگ کیا ہے ترجمہ میں بھی اس آہنگ کو قائم رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

(آزاد ترجمہ)

سمندر کا عشق

پھر جنوں سمندر کا ہے مجھے' پھر بیچ سمندر مرا جہاز
ہو سمت میں ایک ستارے کی جو چلا جارہا دور دراز
موجوں کی ادائیں' گاتی ہوائیں' بادباں لہراتے ہوئے
اور ہنستے بولتے ماجھیوں میں ہم دور دیس کو جاتے ہوئے

خود بڑھ کے سمندر بلا رہا ہے اس کے جزرومد کی پکار
ہے کھینچ رہی کچھ ایسی مجھ کو ' کر نہیں سکتا ہوں انکار
ہاں پھر اک بار وہ بیچ سمندر' بادل گھر گھر آئے ہوئے
اور جھاگ اڑاتی بپھری موجیں طوفاں سر پہ اٹھائے ہوئے

ہے عشق سمندر کا مجھ کو مجھے چاہئے بہتا سمندری گھر
ہر دم ہر سو سرگرم سفر' لائے نہ کبھی خاطر میں خطر
اور ان خوش دل ملاحوں میں ہنس بول کے دوں میں عمر گزار
ہے زندگی موج و طوفاں جن کی' موت گلے کا جن کے ہار

خلیل جبران

وہ لبنان کے ایک عیسائی گھرانے میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم بیروت میں پائی۔ ۱۹۰۵ء میں اس کے والدین بوسٹن (امریکہ) چلے گئے جہاں اس نے ثانوی تعلیم مکمل کی۔ ۱۸۹۸ء میں وہ دوبارہ بیروت آگیا۔ عربی زبان اور ادب سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ بیروت یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اس نے عربی زبان اور ادب کا غائر مطالعہ کیا۔ دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر اس نے نثر اور نظم دونوں میں اپنے قلم کو جولاں کیا۔ اس کی نگارشات بیحد مقبول خاص وعام ہوئیں۔ ۱۹۰۳ء میں بوسٹن واپس آکر اس نے وہاں کے ایک عربی اخبار میں لکھنا شروع کیا۔ اس کے مضامین اس قدر پسند کئے گئے۔ کہ ان کے تراجم نہ صرف انگریزی بلکہ دوسری اہم زبانوں میں کئے گئے۔ اس طرح وہ بہت کم عمری میں عالمی شہرت کا حامل ہوگیا۔

قدرت نے خلیل جبران کو تمام شاعرانہ صلاحیتیں بڑی فیاضی سے عطا کی تھیں۔ شعروادب کے علاوہ اس کو مصوری کا بھی شوق تھا۔ اپنی اس صلاحیت کو جلا بخشنے کے لئے دو سال (۱۰-۱۹۰۸) اس نے پیرس میں گزارے۔ ۱۹۱۲ء میں اس نے نیویارک میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں نظمیں، مقالے اور افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ مصوری کے فن پارے بھی پیش کرتا رہا جو اس کی شہرت اور ہر دلعزیزی میں مزید اضافہ کرتے رہے۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں وہ ایک حادثہ میں جاں بحق ہوا۔ وصیت کے مطابق اسے لبنان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اگرچہ اس نے طویل عمر نہیں پائی مگر اس کی عربی اور انگریزی تصنیفات اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ اس کا انداز بیان حد درجہ پرکشش ہے۔ اپنے مذہب سے دلی لگاؤ رکھنے کے باوجود وہ نہایت وسیع النظر تھا۔ اس کی ساری عمر ظلم و استبداد، غربت وافلاس کے خلاف جہاد کرتے گزری۔ اس کے قلم کے نکلے ہوئے الفاظ بڑے پرزور ہوتے جس کے سبب اسے غریبوں اور مظلوموں کا ترجمان کہا جاتا ہے۔

یہاں خلیل جبران کی ایک شہرہ آفاق نظم کا ترجمہ "رحم اس قوم پر" کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔ یہ نظم میرے محترم دوست، پاکستان کے مایہ ناز مصور، جناب آذر زوبی نے مجھے عنایت فرمائی تھی۔ یہ نظم پڑھتے ہی میرے دل میں اتر گئی اور بیساختہ اردو کے قالب میں ڈھل گئی۔ نظم پڑھ کر مجھے ایسا لگا گویا شاعر نے ہمارے حسب حال ہمارے ہی قابل رحم معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ شاعری جزوی است از پیغمبری

اگرچہ یہ ایک نثری نظم ہے مگر میں نے اپنے ترجمے میں وزن کی پابندی کی ہے اور کہیں کہیں قافیہ پیمائی بھی از خود ہو گئی۔

ترجمہ

رحم اس قوم پر!

دوستو میرے، رستے کے اے ہم گذر
رحم آتا تو ہوگا تمہیں بھی ضرور
ایک اس قوم پر
جو روایات میں اپنی چور
اور ہو مذہب سے دور

رحم اس قوم پر
اپنا کپڑا نہ بنتی ہو اپنے لیے
اپنی روٹی نہ اپنی زمین سے جو پیدا کرے
اپنا مشروب تک خود بناتی نہ ہو

رحم اس قوم پر
اک ہلاکو کو جو ملک و ملت کا ہیرو بنائے
اور گن اس کے گائے
اس کے جور و ستم کو بھی کہتی ہو لطف و کرم

رحم اس قوم پر
جذب و جرات کی کرتی ہو جو سرزنش
اور وہ بیدار ہو جائیں جب
ان کے آگے جھکا دے خموشی سے سر

رحم اس قوم پر
جس کا شیوہ نہ ہو لب ہلانا، مگر
نکلے سڑکوں پہ لے کر جنازوں کا رسمی جلوس
فخر کرنے کو کھنڈرات کافی ہوں جس کے لئے
پوری آواز سے چیختی ہو فقط ایک بار
جبکہ گردن پہ ہو چل رہا خنجر آبدار

رحم اس قوم پر
اہل تدبیر جس کے ہوں روبہ صفت
اور دانشور اس کے فقط بازیگر
اہل فن کے لئے نقل و پیوند کاری ہو فن

رحم اس قوم پر
ہر نئے حکمراں کو کہے شادیانوں سے خوش آمدید
اور رخصت کرے اس کو ذلت کے ساتھ
اور پھر اک نئے آنے والے کے اعزاز میں
شادیانے بجائے

رحم اس قوم پر
جس کے بوڑھے مفکر نحیف ونزار
بولنے سے بھی معذور ہوں
اور جوانمرد جس کے ابھی گاہواروں میں ہوں

رحم اس قوم پر
ٹولیوں میں جو ہو بٹ گئی
اور ہر ٹولی ہو نعرہ زن
ہم الگ قوم ہیں!

رابرٹ فراسٹ

ROBERT FROST

(1874-1963)

عہد نو کے امریکی شعراء میں رابرٹ فراسٹ ایک اہم نام ہے۔ وہ سان فرانسکو میں پیدا ہوا۔ نو برس کا تھا کہ باپ کا سایہ اٹھ گیا اور ماں بچوں سمیت نیوانگلینڈ کے علاقہ میں منتقل ہوگئی جو اس کا آبائی وطن تھا۔ یہاں اس نے گزر اوقات کے لئے اسکول ٹیچر کی ملازمت اختیار کرلی۔ فراسٹ فطری شاعر تھا۔ ہائی اسکول ہی کے زمانے سے اس نے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرکے اس نے ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر چند ماہ بعد سخت بیمار پڑگیا اور گھر چلا آیا۔ صحت یاب ہوکر چند سال کاشتکاری کی۔ پھر اسکول ٹیچر ہوگیا۔ اس تمام عرصہ میں پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ شاعری بھی کرتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ انگلینڈ چلا گیا جہاں ایک اسکول میں ٹیچر ہوگیا۔ اس دوران میں اس کی ملاقات ازرا پاؤنڈ (Ezra Pound) سے ہوگئی۔ جو ان دنوں انگلینڈ میں اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ پاؤنڈ کی وساطت سے اس کو ایٹس کے حلقہ شعراء سے متعارف ہونے اور ان سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء میں اس کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے جنہوں نے فراسٹ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ امریکہ واپس آگیا جہاں اس کی بڑی

پذیرائی ہوئی۔ اکثر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی جانب سے پیشکش ہوئی۔ اس کی شاعری کے اعتراف میں اس کو پولیزر پرائز آف پوئٹری

Pulizer Prize of Poetry کے اعزاز سے ۱۹۲۴ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۳ء میں نوازا گیا۔

ذیل میں فراسٹ کے آخری دنوں کی ایک نظم (Away) کا منظوم ترجمہ "جاتے جاتے" کے عنوان سے اوریجنل رائم اسکیم میں پیش خدمت ہے۔

انگریزی زبان میں شعر کہنے کے لئے "گیت گانے" کی اصطلاح مروج ہے اسی کو میں نے بھی یہاں انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

رابرٹ فراسٹ

ترجمہ

جاتے جاتے

میں بزم جہاں سے جاتے جاتے
لے لے کے مزے ہوں گا رہا گیت
گزری ہے جو عمر گاتے گاتے
گیتوں میں یہ دن بھی جائیں گے بیت

اور بعد مرے ادیب و نقاد
فرمائیں گے خیر سے مرا ذکر
میں بے نیاز داد و بیداد
ہر دور کو دوں گا دعوت فکر

جائے گا نہیں مجھے نکالا
پاداش خطا پہ مثل آدم
اور ساتھ مرے نکلنے والا
ہوگا نہ کوئی رفیق و ہمدم

یارب میں بشر ہوں، شر سے مشتق
رحمان و رحیم شان تیری
گہہ منکر حق تو گہہ انا الحق
قابو میں نہیں زبان میری

میں عفو و عطا پہ تیری نازاں
کرتا رہا شوخیاں ہوں تجھ سے
تسلیم ہے اپنی فرد عصیاں
مت مانگ مرا حساب مجھ سے

کہتا میں رہا، کیا جو محسوس
تو نے وہ صلاحیت عطا کی
تھی گر یہ خطا، خدائے قدوس
بیشک، تھی میں نے یہ خطا کی

لیکن میں سوئے عدم، خدایا
اس شرط پہ جاؤں گا یہاں سے
گر دل نہ لگا، مزہ نہ آیا
آجاؤں گا لوٹ کر وہاں سے

T. S. ELIOT
ٹی۔ایس۔ایلیٹ
(1888-1965)

ٹامس اسٹرنز ایلیٹ (Thomas Stearns Eliot) جدید شعراء میں اہم مقام رکھتا ہے۔ وہ شاعر ادیب' نقاد' ڈرامہ نگار' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عہد حاضر کی شاعری میں وہ "جدیدیت" کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ وہ امریکہ میں نیو انگلینڈ کے علاقہ میں پیدا ہوا۔ ہارورڈ اور یورپ میں تعلیم پائی اور ۱۹۱۶ء میں لندن منتقل ہوگیا۔ یہاں ازرا پاؤنڈ (Ezra Pound) کے حلقہ شعروادب سے متعارف اور مستفید ہوا۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء میں اس کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے لیکن اس کی شہرت کا اصل سبب اس کی طویل نظم (Waste Land) ۱۹۲۲ء میں منظر عام پر آئی جس میں پہلی عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کا تذکرہ بڑے دلدوز اور موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ اس نظم نے ایلیٹ کو شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ۱۹۲۷ء میں اس نے برطانوی شہریت لے لی اور چرچ آف انگلینڈ کا مقلد ہوگیا۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی ایک اور طویل نظم (Ash Wednesday) شائع ہوئی اور پھر وقفہ وقفہ سے اس کی نظم (Four Quarten) شائع ہوئی جسے (Waste Land) جیسی مقبولیت تو نہ ملی لیکن اسے ایلیٹ کی بہترین شاعری سمجھا جاتا ہے۔ انگلینڈ کے دوران قیام میں اس نے سات ڈرامے لکھے جن میں کئی اس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔ شاعر اور ڈرامہ نگار کے علاوہ ایلیٹ اپنے وقت کا مانا ہوا نقاد تھا۔ اس کی پہلی تنقیدی کتاب (The Sacred Wood)

۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ ۲۰ء کی دہائی میں اس کی مختلف تنقیدی تصنیفات منظر عام پر آئیں۔ ۳۹-۱۹۳۲ء کے دوران وہ ایک تنقیدی رسالہ (The Criterion) کا اڈیٹر رہا۔ اس کی آخری تنقیدی کتاب (To Criticize the Critic) اس کے انتقال کے بعد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

اس مجموعہ تراجم میں ایلیٹ کی مشہور نظم (Little Gidding) سے ماخوذ دو اقتباس کے ترجمے "خزاں کی بہار" اور "چار عناصر" کے عنوانات سے پیش کئے گئے ہیں۔ "خزاں کی بہار" کا اصل متن ایلیٹ کے یہاں نثری نظم کی صورت میں ہے جس کا ترجمہ قوافی سے آزاد مگر وزن میں پابند ہے۔ جبکہ "چار عناصر" کا اصل متن ایلیٹ کے یہاں اوزان و قوافی کی پابندیوں کے ساتھ ہے لہٰذا اس کا ترجمہ بھی ان پابندیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ البتہ اس کا ابتدائی اسٹنزا تمہید کے طور پر مترجم کی جانب سے اضافہ ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

ترجمہ

"چار عناصر"

چار عناصر : ہوا' مٹی' پانی اور آگ
جن سے ترتیب ہے زندگانی کا راگ
فی الحقیقت لطیف استعارے ہیں یہ
چند علامات ہیں' کچھ اشارے ہیں یہ
حسن و پاکیزگی' مہر و صدق و صفا
ہیں رموز ان گنت بہر ذہن و ذکا
ان رموز و کنایہ کے پیش نظر
دیکھیئے چند امثال بود بشر

ایک بوڑھے کی ہے آستیں پر جو گرد
تمغہ عزم و ہمت ہے اور شان مرد
ہے ہوا پر جمائی جو مٹی نے تہہ
اس میں امید نے ڈال دی ہے گرہ

پھر بناکر ہوا میں محل شاندار
وقت کرتا ہے اس وقت کا انتظار
ناامید ہوکے امید ہوجائے فوت
موت امید کی ہے ہوا کی بھی موت

مٹی، پانی کہ اک خشک اور ایک تر
کرتے رہتے ہیں عالم کو زیر و زبر
خشک سالی ہے اور گاہ سیلاب ہے
جاری ہر آن اک جنگ اعصاب ہے
گل آدم، تری آب بھی بہہ گئی
اب نمود و نمائش فقط رہ گئی
اور ہنسی سے خوشی جبکہ ہوجائے فوت
جانئے ہے سراسر یہ مٹی کی موت

آگ، پانی کا ہوتا ہے جس جا عمل
دم میں آبادیوں کو ہیں جاتے نگل
آگ پانی اڑاتے ہیں ان کا مذاق
جن کی قربانیاں بے سیاق و سباق
آگ پانی بھی اس جا پہ جاتے ہیں سڑ
شرم و غیرت سے بیچارے جاتے ہیں گڑ
تاخت تاراج ہیں دیکھ پاتے جہاں
کسی محراب و منبر کے ٹوٹے نشان

اور اب ایلیٹ کا اپنا منفرد انداز ملاحظہ ہو۔ موسم سرما کے ایک انتہائی سرد دن کی شدید سردی کو الفاظ کی گرمی سے گرمانا، خزاں میں بہار پیدا کرنا، صنعت تضاد کے نگینے تراشنا، ایلیٹ ہی کا زورِ قلم اس ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔

ترجمہ

خزاں کی بہار

اک ہے موسم عجب، کہیئے جس کو خزاں کی بہار
جبکہ ٹھہرا ہوا وقت کے درمیاں آفتاب
مسکراتا ہے تھامے ہوئے آب و گل کی طناب
سال کا سب سے چھوٹا وہ دن کہر اور دھند میں
ہے نظر آتا روشن تریں، جگمگاتا ہوا
اور تالاب کے آئینے برف سے شعلہ بار
سرد و ساکت ہوا جب دلوں کو ہو گرما رہی
جس کی گرمی دہکتی ہوئی آگ سے بھی سوا
ڈال دیتی ہے جو ٹھٹھری بیجان روحوں میں جان
یہ وہ موسم ہے کہتے ہیں جس کو خزاں کی بہار
اور جس کا کوئی وقت سے عہد نامہ نہیں
دم میں بے برگ اشجار پھولوں سے ہیں لد گئے
لہلہاتے ہوئے برف کے وہ چمکدار پھول
جس کی کلیاں چٹکتی نہ ہیں بیج بنتے کبھی
وہ کڑاکے کے جاڑوں کی تپتی ہوئی گرمیاں
اک ہے موسم عجب، کہیئے جس کو بہار خزاں



.THE AUTHOR

HIS OTHER BOOKS

1. Eulogies & Elegies (Religious Poems)
2. Poems in Praise of the Holy Prophet.
3. Versified English Translation of Farazdaq's Qasida.
4. In the Realm of Rhyme (Original Poems and Rhymed Translations of masterpieces from Arabic, Persian, Hindi and Urdu Poetry).

5 جام بجام مشہور انگریزی شعراء کی شاہکار نظموں کے منظوم اردو تراجم

6 لندن کی سیر (منظوم)

7 انگریزی شاعری کی ایک جھلک چاسر سے ایلیٹ تک

سات صدیوں پر محیط انگریزی شاعری کا مختصر جائزہ، ہر صدی کے نمائندہ شعراء کا تذکرہ

اور ان کی شاہکار نظموں کے منظوم اُردو تراجم

Available from :-
NEW WAY PUBLISHERS
1/17-A, (Big Plot),
Drigh Colony, Karachi.
Tel : 4570961

ملنے کا پتہ
نیو وے پبلشرز
A-۱/۱۷، ڈرگ کالونی کراچی
فون:- ۴۵۷۰۹۶۱